ISSN 2320-6519

AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

سہ ماہی

اورنگ آباد

(اردو)

عکسِ ادب

جلد(۱۲)　　شمارہ(۴۴)　　جولائی تا ستمبر۲۰۲۳ء

مدیراعلیٰ : ڈاکٹر یوسف صابؔر (یوسف خان جبار خان) 09326772575

معاون مدیر : شرجیل احمد خان　موبائل : 09595686784

اعزازی مدیر : ڈاکٹر نخشب مسعود　موبائل : 09372012930

مینجنگ ڈائریکٹر : سیدہ فرزانہ نسیم　موبائل : 09423877584

سرپرست

☆ ڈاکٹر عبدالکریم سالار (جلگاؤں)

☆ نورخاں (جالنہ)

مجلس مشاورت

- علامہ ناوکؔ حمزہ پوری (حمزہ پور)
- علیم صباؔ نویدی (چنئی)
- ڈاکٹر معصوم شرقی (کولکتہ)
- ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ
- شفیع احمد شفیع (پربھنی)
- ڈاکٹر درانی ایس۔ایم (ناندیڑ)
- ڈاکٹر مبین نذیر (مالیگاؤں)
- علیم طاہر (ممبئی)

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر عقیلہ سید غوث

☆ ڈاکٹر عظیم راہیؔ

☆ سید مسعود احمد قیصرؔ

☆ ڈاکٹر عابد حسین محمد صادق

☆ وجاہت قریشیؔ

☆ طاہر حسین طاہر

☆ ڈاکٹر شاہ ایاز

☆ ڈاکٹر حبیب النساء

☆ ڈاکٹر سلیم نواز حشر

☆ ڈاکٹر ارشاد احمد خان

☆ ابراہیم خان

جو کسی خواب نے دیکھا نہ تصور نے کہیں

بات تو جب ہے کہ انسان وہاں تک پہنچے

(ڈاکٹر یوسف صابر)

فی شمارہ	:	۵۰/روپئے
زرسالانہ (بدست)	:	۲۰۰/روپئے
زرسالانہ (بذریعہ پوسٹ)	:	۲۵۰/روپئے
لائبریری کے لئے	:	۲۵۰/روپئے
رجسٹرڈ پوسٹ	:	۳۰۰روپئے

سرکولیشن منیجر : تنزیل احمد خان (Mob. 09284747707)

خریداری اور اشتہار کے لئے منی آرڈر، چیک اس نام سے بھیجیں :

Yousuf Khan Jabbar Khan
Bank of Maharashtra
S/Ac/ No. 60021185230
IFSC code MAHB 0000278

SBI
S/Ac/No.SB 52068629025
IFSC code SBIN 0020786

مقام اشاعت/ترسیل زر/مضامین/تخلیقات سے متعلق خط و کتاب کا پتہ

Yousuf Khan Jabbar Khan
Editor : **Aks-e-Adab** *(Quarterly)*
P.No.174, S.No.201,
Savera Park, Behind Ibrahim Masjid, Jatwada Road,
Harsul, Aurangabad.
Dist. Post AURANGABAD (M.S.) 431008
Mobile : 09326772575
email : akseadab@gmail.com

Website : www.akseadaburdu.com

طباعت

نوری آفسیٹ پریس

مرزا غالب روڈ، جونا فاران اسپتال، مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر)

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

''عکسِ ادب'' سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی اورنگ آباد کی عدالت میں ہی ہوگی۔

ISSN 2320-6519

AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

☆ ترتیب و تزئین ☆

	اداریہ	ڈاکٹر یوسف صابر	۳
	اسلامیات	سیدہ فرزانہ نسیم	۴
	عکس ایماں	حمد پاک و مناجات، دعا اور دعائیہ رباعی (محسن عظیم انصاری، خواجہ منیر الدین منیر ، شفیع احمد شفیع ، شاہ حسین نہری)	۵
	مغز ادب	ڈاکٹر یوسف صابر	۶
☆	مضامین		
	دکنی شعر و ادب میں بھاکارس	ڈاکٹر میمونہ بیگم سرڈگی	۷
	پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی و تجزیاتی مطالعہ	محبوب عالم	۹
	ماہنامہ گگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر	محمد احمد دانش روانوی	۱۱
	انار/رمان: بہترین صحت کا ضامن	ڈاکٹر رفیع الدین ناصر	۱۲
	شہر اورنگ آباد میں افسانچہ نگاری کا رجحان	ڈاکٹر عظیم راہی	۱۳
	قصے قدریسفی کے	سہیل بیابانی	۱۴
	برمحل اشعار اوران کے ماخذ	خلیق الزماں نصرت	۱۶
☆	شاعری	غزلیات شعرائے پربھنی مع تعارف	۱۷
	غزلیں	بشارت علی خان اختر، علیم صبا نویدی، کلیم کسک، رضا جالنوی	۱۸
		اطہر کلیم، کے انیس اظہر، ظفر صدیقی، فہیم خاتون مسرت	۱۹
		ڈاکٹر مختار علی نفیس، رئیس عاجز پرتوری، مظہر رحمان	۲۳
		خلیل صادق	۱۵
		علیم صبا نویدی	۲۱
	رباعیات	شاہ حسین نہری	۵۳/۱۸
		کے انیس اظہر	۲۳
	قطعات	رضا جالنوی	۱۹
		سید طاہر حسین طاہر، فیروز رشید	۲۰
	ماہیے	طٰہٰ صدیقی	۱۹
		ڈاکٹر یوسف صابر	۲۳
	ہائیکو	فراغ دہلوی	۱۹
	نظمیں	روشنی کا مسافر — ارشد صدیقی	۲۱
		چاند پہ اترا ہندوستان — ارشد مینا نگری	۲۲
		بچہ اور اردو — علیم طاہر	۲۲
		ماں — شاکر خان شاکر	۲۲
		آہ فلسطیں — سراج زیبائی	۳۷
	افسانوی ادب	مختصر تعارف: مرزا عظمت اللہ بیگ	۲۴
	افسانہ	کاش ایسا ہوتا — رمانہ تبسم	۲۶
		پتھر موم ہو گئے — فوزیہ نسرین	۲۷
	افسانچہ	مثالی ٹیچر — ڈاکٹر یوسف صابر	۶۰
☆	مضامین	ڈاکٹر عصمت جاوید کی حیات و ادبی خدمات — سید اشفاق علی	۲۸
		اردو ماہیا نگاری اور خواتین قلمکار — ڈاکٹر صبیحہ خورشید	۳۱
		مرد مجاہد منظور اثر اور پیڑ کا ادبی پس منظر — ندیم مرزا	۳۳
		پھول اور کانٹوں کا شاعر — فوزیہ نسرین	۳۵
		موبائل فون کے معصوم بچوں پر مضر اثرات — محسن خان	۳۵
		شریف ارشد کی علمی و ادبی کاوشیں — ڈاکٹر عبدالحلیم انصاری	۳۶
☆	خصوصی گوشہ	(ڈاکٹر عظیم راہی)	۳۸ تا ۵۷
	قلمی تعاون	☆ پروفیسر عتیق اللہ ☆ محبوب راہی ☆ نذر فتح پوری ☆ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ☆ عارفہ خالد شیخ ☆ سلیم انصاری	
☆	تعارف و تبصرے		۸۵
☆	خاکچے	ندیم مرزا	۶۱
☆	خلوص عکس ادب (منتخب خطوط)		۶۲
☆	اخبار عکس ادب		۶۳

کافی نہیں ہوا و بال و پر جہان میں
کچھ حوصلہ بھی ہوتا ہے لازم اڑان میں

ڈاکٹر یوسف صابر

لائف ممبران

(۱) عتیقہ اطہر موسیٰ	(اورنگ آباد)	(۳۱) سید غازی علی غازی	(جالنہ)
(۲) قاضی خسرو	(اورنگ آباد)	(۳۲) تحسین درانی	(جالنہ)
(۳) ڈاکٹر مسرت فردوس	(اورنگ آباد)	(۳۳) عبدالوہاب (اسسٹنٹ پروفیسر)	(جالنہ)
(۴) ڈاکٹر کیرتی مالنی جاوَلے	(اورنگ آباد)	(۳۴) ڈاکٹر نسیم بیگم	(پربھنی)
(۵) انصاری ابرار احمد	(اورنگ آباد)	(۳۵) ڈاکٹر سلیم محی الدین	(پربھنی)
(۶) مہر سلطانہ جبار قریشی	(اورنگ آباد)	(۳۶) خضر احمد خان شرر	(پربھنی)
(۷) ڈاکٹر عبدالرب	(اورنگ آباد)	(۳۷) حبیب النساء	(پربھنی)
(۸) سید وہاب الحق	(اورنگ آباد)	(۳۸) ڈاکٹر قاضی کلیم	(پربھنی)
(۹) محمد سعید احمد محمد سردار	(اورنگ آباد)	(۳۹) ڈاکٹر شبانہ درانی	(ناندیڑ)
(۱۰) ڈاکٹر فرحت نسرین	(اورنگ آباد)	(۴۰) ڈاکٹر ارشاد احمد خان	(ناندیڑ)
(۱۱) ڈاکٹر شرف النہار	(اورنگ آباد)	(۴۱) شیخ ہما کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر)	(ناندیڑ)
(۱۲) ڈاکٹر معین فاطمہ	(اورنگ آباد)	(۴۲) اظہر احمد غلام یزدانی	(ناندیڑ)
(۱۳) ڈاکٹر مخدوم فاروقی	(اورنگ آباد)	(۴۳) اختر صادق	(ناندیڑ)
(۱۴) مولانا آزاد کالج	(اورنگ آباد)	(۴۴) محمد اختر	(ناندیڑ)
(۱۵) شیخ شہلا سلطانہ	(اورنگ آباد)	(۴۵) ڈاکٹر سید اصفیہ مدنی سید زکریا	(بیڑ)
(۱۶) برہانی نیشنل اردو پرائمری اسکول	(اورنگ آباد)	(۴۶) ڈاکٹر سید فرید احمد نہری	(بیڑ)
(۱۷) ڈاکٹر قاضی رضوانہ شمیم	(اورنگ آباد)	(۴۷) ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم	(پونہ)
(۱۸) اسماء روحی قادری	(اورنگ آباد)	(۴۸) ڈاکٹر عنبر خاتون	(ہزاری باغ)
(۱۹) شیخ ظہور احمد	(اورنگ آباد)	(۴۹) ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل	(ہزاری باغ)
(۲۰) ابراہیم خان لیاقت خان	(اورنگ آباد)	(۵۰) رشید ضارب	(حیدرآباد)
(۲۱) ڈاکٹر قمر النساء	(خلد آباد)	(۵۱) ڈاکٹر عقیلہ سید غوث	(امبہ جوگائی)
(۲۲) مبین نذیر	(مالیگاؤں)	(۵۲) ڈاکٹر مقبول احمد مقبول	(ادگیر)
(۲۳) مقصود اشرف	(مالیگاؤں)	(۵۳) ڈاکٹر خالد مبشر	(دہلی)
(۲۴) ڈاکٹر شاہ ایاز	(مالیگاؤں)	(۵۴) سید سمیع الدین	(بیدر)
(۲۵) ڈاکٹر شاداب روش	(مالیگاؤں)	(۵۵) J.J.T.University	(راجستھان)
(۲۶) انصاری عتیق احمد محمد شعبان	(مالیگاؤں)	(۵۶) محبوب پاشا اعظمی	(چنئی)
(۲۷) سٹی کالج	(مالیگاؤں)	(۵۷) ڈاکٹر نکہت آراء	(شولاپور)
(۲۸) خان عبدالغفار خان کالج	(پاتھری)	(۵۸) شیخ ارم فاطمہ	(نلنگہ)
(۲۹) عالیہ کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر)	(جالنہ)	(۵۹) ڈاکٹر محمد ناصر اللہ انصاری	(لاتور)
(۳۰) ڈاکٹر سلیم نواز حشر جعفر آبادی	(جالنہ)	(۶۰) احمد عباس خان	(ایوت محل)

اداریہ

یہ ضروری نہیں ہر تیر نشاں تک پہنچے
حق ہو آواز تو پہنچا دو جہاں تک پہنچے

(ڈاکٹر یوسف صابر)

افسانچہ ایک انتہائی مختصر افسانوی نثری صنف ہے۔ یہ دور شعری ونثری مختصر اصناف کا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی کا تعلق نثر کی متعدد اصناف سے ہے۔ انھوں نے تحقیق وتنقید نگاری، خاکہ نگاری، تبصرہ نگاری، رپورتاژ نگاری اور افسانہ وافسانچہ نگاری کے علاوہ انھوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ افسانوی ادب میں افسانچہ نگاری اور غیر افسانوی ادب میں تحقیق وتنقید ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ عظیم راہی کی ''اردو افسانچہ کی روایت'' کتاب جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی، افسانچہ کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی آج تک جاری ہے۔ عظیم راہی نے ۲۰۱۵ء میں ''اردو افسانچہ کی مقبولیت اور پیش رفت'' کے عنوان سے افسانچہ کے موضوع پر دوسری کتاب تصنیف کی۔ اسے بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر عظیم راہی کی متعدد افسانچے ومضامین متعدد اخبارات ورسائل میں چھپ چکے ہیں۔ عظیم راہی نے اب تک دو درجن افسانچوں کے مجموعے کے پیش لفظ لکھے ہیں اور تقریباً ایک درجن افسانچوں کے مجموعوں پر تبصرے کئے ہیں جو ملک کے معتبر رسائل وجرائد میں چھپ چکے ہیں۔ افسانچہ کی تخلیق، تحقیق وتنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر عظیم راہی کی خدمات کا کئی جگہ اعتراف کیا گیا ہے۔ ای ٹی وی اردو سے ایک خصوصی انٹرویو ۱۱/نومبر ۲۰۱۸ء کو ٹیلی کاسٹ ہوا اور آکاشوانی اورنگ آباد سے ایک انٹرویو ۱۶/جولائی ۲۰۱۷ء کو نشر ہوا تھا۔ بحیثیت افسانچہ نگار اردو کے مؤقر قدیم رسالہ 'شاعر' (ممبئی) نے ایک گوشہ شائع کیا تھا۔ مہاراشٹر میں ڈاکٹر عظیم راہی کی صدارت میں اب تک کئی محفل افسانچہ کا انعقاد عمل میں آچکا ہے۔

افسانچہ کے سلسلے میں ڈاکٹر عظیم راہی کا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کام آج بھی جاری ہے۔ اب تک ان کے افسانچوں کے تین مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے ایک طالب علم فردوس احمد بھٹ نے 'عظیم راہی بحیثیت افسانچہ نگار' ایم فل کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی ہے اور اسے کتابی شکل میں شائع بھی کیا ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ''عکس ادب'' نے ایک مختصر سا گوشہ ترتیب دیا ہے۔ افسانچہ نگاری میں بہتری اور افسانچوں کے معیار کو بلند کرنے کی یہ ایک سعی ہے۔ اسی ضمن میں اس کام میں کون کون آگے بڑھتا ہے اور کس طرح کی مدد کرتا ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

خاکسار
ڈاکٹر یوسف صابر
مدیر اعلیٰ
سہ ماہی 'عکس ادب' اردو (اورنگ آباد)

دینی معلومات

وہ قبائل جن کا تذکرہ قرآن میں ہے

(۱)یاجوج (۲)ماجوج (۳)عاد (۴)ثمود (۵)مدین (۶)قریش (۷)روم

القاب جو قرآن کریم میں مذکور ہیں

''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ان ہی کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔''مسیح'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا۔''الیاس'' حضرت ادریس علیہ السلام کا۔''ذوالکفل'' حضرت الیسع یا یوشع علیہ السلام کا یا زکریا علیہ السلام کا۔''نوح'' حضرت عبدالغفار علیہ السلام کا' زیادہ رونے کی وجہ سے 'نوح' لقب مشہور ہوگیا۔''ذوالقرنین'' سکندر بادشاہ کا، جن کے نبی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور ولی تو سب ہی کے نزدیک ہیں۔ یہ لقب اس وجہ سے ہے کہ وہ گیسو والے تھے۔قرن گیسو کو کہتے ہیں یا اس وجہ سے کہ عالم کے دونوں طرف مشرق اور مغرب میں اس نے سیاحت اور سفر کیا یا کریم الطرفین یعنی ماں اور باپ دونوں طرف سے بزرگ ہونے کے سبب۔ (کذا فی مجمع البحرین) ''فرعون'' ولید بن مصعب کا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد مصر کا بادشاہ تھا۔''تبع'' قرآن شریف میں تو اسد بن ملکے کرب کا لقب ہے اور عرف کے اعتبار سے ہر اس بادشاہ کا لقب ہے جو یمن کا بادشاہ ہو۔ (ماخوذ: تفسیر قرآن)

سب سے ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کا جنتی کون

حضرت معیرہ بن شعبہؓ ایک مرتبہ منبر پر (تشریف رکھے) فرمارہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک مرتبہ اپنے رب سے پوچھا کہ جنت والوں میں سے سب سے کم درجہ کا کون سا آدمی ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ ایک آدمی ہوگا جو سارے جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد جنت میں داخل ہوگا۔اس آدمی سے کہا جائے گا جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ آدمی عرض کرے گا اے میرے رب میں کیسے جاؤں وہاں تو سب لوگوں نے اپنے اپنے مراتب، اپنی اپنی جگہوں کو متعین کرلیا ہے۔ (یعنی جنت کے تمام محلات پر سب جنتیوں نے قبضہ کرلیا ہے) تو پھر اس آدمی سے اللہ فرمائیں گے کہ کیا تو اس بات پر راضی ہے کہ تجھے اتنا ملک دیا جائے جتنا دنیا کے بادشاہ کے پاس تھا؟ وہ کہے گا اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ پروردگار اس سے فرمائیں گے جاؤ اتنی ملک ہم نے تجھے دے دیا اور اتنا ہی اور۔ اور اتنا ہی اور۔اور اتنا ہی اور۔اور اتنا ہی اور۔اور پانچویں مرتبہ میں وہ آدمی کہے گا میں راضی ہوگیا۔اے میرے پروردگار۔اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے تو یہ بھی لے لو اور اس کا دس گنا اور لے اور جو تیری طبیعت چاہے اور تیری آنکھوں کو پیارا لگے وہ بھی لے لو۔ وہ کہے گا پروردگار میں راضی ہوگیا۔اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ سب سے بڑے درجے والا جنتی کون سا ہے؟ اللہ نے فرمایا وہ تو وہ لوگ ہیں جن کو میں نے خود منتخب کیا ہے اور ان کی بزرگی اور عزت کو اپنے دست قدرت سے بند کردیا اور پھر اس پر مہر بھی لگادی تو یہ چیزیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر اُن نعمتوں اور مرتبوں کا خیال گزرا اور اس چیز کی تصدیق کی جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔وہ کہتا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ یعنی ''کسی کو معلوم نہیں کہ ان کے لئے ان آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان چھپا کر رکھا ہے۔'' (مسلم:۴۶۵)

(مختصر احادیث۔محمد بدیع الزماں خان' ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ وسیشن جج)

از : سیدہ فرزانہ نسیم (اورنگ آباد)
9326772575

عکسِ ایمان

حمدِ باری

محسن عظیم انصاری (لکھنؤ)
موبائل : 9451300431

اس جہاں کو دوپہر، شام و سحر دیتا ہے رب
اور نہال و نخل کو پھول و ثمر دیتا ہے رب

تیرگی شب کی مٹاتا ہے وہی حسنِ ازل
قمقمے تاروں سے، مشعل سا قمر دیتا ہے رب

جھومتے بادل چلے آتے ہیں اک دم صف بہ صف
بارشوں سے فصل کے لعل و گہر دیتا ہے رب

بینا نابینا، جو چشمِ دل ہیں موندے ان کو بھی
اپنے ہونے کا پتا، اپنی خبر دیتا ہے رب

منکرینِ حق کے کرتا رزق میں کب ہے کمی؟
دہریوں کو دودھ، میوے اور شکر دیتا ہے رب

جن کو انساں ہی دباتے جاتے ہیں بے وجہ یاں
ان دبے، کچلوں کو بندق اور تبر دیتا ہے رب

ہاں پکڑتا ہے انھیں جو ننگ ہیں در ایں جہاں
کاٹ ان کی چال، غائب کر ڈگر دیتا ہے رب

الف بوٹی، کیا سے کیا، کرتا عطا ہے وہ مدام
ہیرے، زر مٹّی کو، بحروں کو گہر دیتا ہے رب

بعد ساعت حشر ہے، جنّت، جہنّم، اے عظیم
حرّیت سے ان تلک پکّا سفر دیتا ہے رب

☆☆☆

مناجات

خواجہ منیرالدین منیّر (ناندیڑ)
موبائل : 9096802243

عشق کو برگ و بار دے مولیٰ
زندگی کو سنوار دے مولیٰ

تری حمد و ثناء کروں پل پل
دل کو ازلی خمار دے مولیٰ

علم نافع مجھے عطاکر دے
پھر عمل میں نکھار دے مولیٰ

دل کی بنجر زمیں ہری کردے
رحمتوں کی پھوار دے مولیٰ

ہم کہ بھٹکے ہوئے تیرے بندے
راہ حق سے گزار دے مولیٰ

چھید کتنے ہیں میری کشتی میں
تو کنارے اُتار دے مولیٰ

منتظر ہیں شجر بھی رحمت کے
دل نشین برگ و بار دے مولیٰ

آئے تو پھر پلٹ کے نہ جائے
دائمی وہ بہار دے مولیٰ

تیرے رحم و کرم کا کیا کہنا
بارِ عصیاں اُتار دے مولیٰ

یہ دعا ہے منیّر کی یارب
میرے فن کو نکھار دے مولیٰ

☆☆☆

دعا

(سہ بحرین)

شفیع احمد شفیعؔ (پربھنی)
موبائل : 7972462122

کاسۂ دل میں حقیقت ڈال دے
جن سے تو راضی ہو وہ اعمال دے
کب کہا میں نے مجھے کچھ مال دے
ہر خطا ہنس کے تو میری ٹال دے
خون کیا یوں ہی بہے مظلوم کا
ظالموں کو بھی ذرا بھونچال دے
کیوں گلا سردی کا ہوگا دھوپ کا
ذکر کی تیرے ہی تو جب شال دے
بات جو بھی میں کروں میٹھی کروں
نیم کی منہ میں نہ میرے چھال دے
آدمی سے جو رکھے کد آدمی
شیشۂ دل میں نہ وہ تو بال دے
احمدِ عاصی کی ہے اتنی دعا
خواہشوں کا تو مجھے مت جال دے

☆☆☆

دعائیہ رباعی

شاہ حسین نہری (اورنگ آباد)
موبائل: 9225303313

ہوجائے معافی سے تلافی، یارب!
اس طرح سے پاجائیں خلاصی' یارب!
اللہ کرے معاف ہم بندوں کو
ٹل جائے جو ہم پر ہے بلا سی' یارب

ISSN 2320-6519
AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

مغزادب

ڈاکٹر یوسف صابرؔ (اورنگ آباد)
موبائل : 9326772575

☆ رپورتاژ کے معنی اطلاع یا خبر دینا ہے۔

☆ رپورتاژ کا مفہوم مشاہدات اور پیش آنے والے واقعات بیان کرنا ہے۔

☆ رپورتاژ میں ادبی انداز میں کسی جلسے، تقریب، واقعہ یا حادثے کی روداد مرتب ہوتی ہے۔

☆ رپورتاژ نثری صنف ادب ہے۔

☆ رپورتاژ ایک ایسی چلتی پھرتی تصویرکشی ہے جس میں خود مصنف کی ذات، اسلوب، قوت متخیلہ، تخلیقی توانائی اور معروضی صداقت موجود ہوتی ہے۔

☆ بقول ارشاد خان رپورتاژ کی پہچان اس کی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔

☆ بقول پروفیسر مجید بیدار رپورتاژ کے فن اور ہیئت کے لئے پیشکش کا حسن، واقعاتی عمل، تفصیل وتعبیر، زبان وبیان کی تخلیقی فضا اور صحافتی عمل ضروری ہے۔

☆ بقول ارشاد احمد خان رپورتاژ نگاری کا فن اور اس کا اظہار حسب ذیل عنوانات کے ساتھ ممکن ہے۔

(۱) اسلوب (۲) ہیئت (۳) صحافت (۴) رومانیت (۵) افسانویت (۶) واقعیت (۷) قوت تحریر (۸) اقتباسی عمل (۹) جبریہ انداز

☆ رپورتاژ فرانسیسی لفظ ہے۔

☆ رپورتاژ لفظی اور معنوی اعتبار سے رپورٹ سے قریب ہے۔

☆ رپورتاژ ایک ایسی جدید نثری صنف ہے جس میں صحافتی انداز اور امورِ خانہ شعور کے ساتھ ساتھ تاثرات اور احساسات کا خوبصورت اظہار ہوتا ہے۔

☆ بقول پروفیسر احتشام حسین: رپورتاژ کو ہم واقعات کی ادبی محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔

☆ بقول خان سحاب رپورتاژ (Reportage) فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'اطلاع' یا 'خبر' کے ہیں۔

☆ بقول ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم رپورتاژ کا رشتہ انگریزی لفظ Report اور فرانسیسی لفظ Reportage سے بنتا ہے۔

☆ حمید اختر کو صنفِ رپورتاژ کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ ۱۹۴۰ء میں ''یادیں'' عنوان سے شائع ہونے والی تحریر اردو زبان و ادب کے اولین رپورتاژوں میں شامل ہے۔

☆ ''پودے'' رپورتاژ نگار کرشن چندر کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''صبح ہوتی ہے'' کرشن چندر کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''کہت کبیر سنو بھئی سادھو'' پرکاش پنڈت کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''بمبئی سے بھوپال تک'' عصمت چغتائی کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''ایک ہنگامہ'' صفیہ اختر کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''خزاں کے پھول'' عادل رشید کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''چھٹا دریا'' فکر تونسوی کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''دجلا سے فرات تک'' شفیق الرحمٰن کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''جب بندھن ٹوٹ گئے'' تاجور سامری کا رپورتاژ ہے۔

☆ ''اور خدا دیکھتا رہا'' جمنا داس کا رپورتاژ ہے۔

☆ تاریخ نگاری اور رپورتاژ نگاری ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔

☆ عبدالعزیز کی تصنیف ''اردو میں رپورتاژ نگاری'' رپورتاژ کے موضوع پر اولین کتب میں شامل ہے۔

☆ ''دو ملک ایک کہانی'' ابراہیم جلیس کا رپورتاژ ہے۔

☆ رپورتاژ ''پو پھٹے'' رپورتاژ نگار خدیجہ مستور۔

☆ رپورتاژ ''ایک رات گذری ہے ایک صدی گذری ہے'' رپورتاژ نگار اجمل اجملی۔

☆ رپورتاژ ''مستقبل ہمارا ہے'' رپورتاژ نگار عبداللہ ملک

☆ رپورتاژ ''دلی کی بپتا'' رپورتاژ نگار شاہد احمد دہلوی

☆ رپورتاژ ''اجالے کی طرف'' رپورتاژ نگار عنایت اللہ

☆ رپورتاژ ''کیوں تیرا راہ گذر یاد آیا'' رپورتاژ نگار خورشید انور جیلانی۔

☆ رپورتاژ ''سفید اور سرخ ستارے کے درمیان'' رپورتاژ نگار ابراہیم جلیس۔

☆ رپورتاژ ''جہلم کے اس پار'' رپورتاژ نگار ظ۔انصاری

☆ رپورتاژ ''پشکن کے دیس میں'' رپورتاژ نگار جگن ناتھ آزاد۔

☆ رپورتاژ ''کتابوں کی تلاش'' رپورتاژ نگار ڈاکٹر گیان چند۔

☆ رپورتاژ ''ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ'' رپورتاژ نگار سلمیٰ عنایت اللہ۔

☆ رپورتاژ ''عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ'' رپورتاژ نگار عاتق شاہ۔

☆ رپورتاژ ''اے بنی اسرائیل'' رپورتاژ نگار قدرت اللہ شہاب۔

☆ رپورتاژ ''نقاب اور چہرے'' رپورتاژ نگار سلمیٰ صدیقی۔

☆ رپورتاژ ''بمبئی سے اودے پور تک'' رپورتاژ نگار ندا فاضلی۔

☆ بقول علی سردار جعفری رپورتاژ نگاری صحافت اور افسانہ کی درمیانی کڑی ہے۔

☆ رپورتاژ ''کشمیر اداس ہے'' رپورتاژ نگار محمود ہاشمی۔

☆☆☆

ISSN 2320-6519
AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

دکنی شعروادب میں بھا کارس

ڈاکٹر میمونہ بیگم سرڈگی (اسسٹنٹ پروفیسر)
شعبہ اردو۔ کے بی این یونیورسٹی کلبرگی

☆خلاصہ (Abstract)

سرزمین ہندوستان کی عظمت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ عرصۂ دراز سے سونے کی چڑیا کہلاتی رہی ہے۔ سرزمین دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہیں سے شعروادب کی تخلیق کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد شمالی ہند اور بیرون ہند سے علماء فضلاء ادباء اور شعراء دکن آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فارسی اور عربی کے ممتاز شعراء نے دکنی ماحول کو قریب سے دیکھا اور یہاں کی زبان، تہذیب اور ثقافت سے خود کو قریب تر محسوس کیا۔ مذہبی علما اور صوفیا کرام نے اپنے اظہار کا وسیلہ دکنی زبان ہی کو بنایا، اس لیے کہ یہ عوام کی زبان تھی، بادشاہ سے لے کر کسان تک دکنی زبان بولتے تھے۔ اس مختصر مقالے میں دکنی شعروادب میں بھا کارس پر بات کی گئی ہے۔

☆تعارف (Introduction)

دنیائے ادب میں ایسے بے شمار بادشاہ گذرے ہیں جو ادب کی تاریخ میں اپنے بیش بہا گنجینۂ شاہ کار کی وجہ سے یادگار زمانہ ہیں۔ سرزمین دکن پر امراء، علما، ادبا، شعراء نے بھی شاہی طبقے میں جنم لیا۔

ایک جگہ تحریر ہے: ''سند کے طور پر دراوڑی اور سنسکرت زبانوں کے شعروادب کو لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ ایشیاء کی نوخیز زبان کو ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں''۔[1]

دکن ایک ایسا وسیع وعریض علاقہ ہے جہاں اردو زبان وادب کی قدیم روایت پروان چڑھی اور ساڑھے تین سو سال تک گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی بھی کرتی رہی۔ اس مقالے میں دکنی ادب کے نمایاں خدوخال پر مختلف زبانوں کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے اسی کے پیش نظر دکنی ادب میں ''بھا کارس'' کا مختصر جائزہ لیا گیا۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے کیا خوب کہا تھا: ''میری نظمیں اپنے سُر اپنی لے ساتھ لاتی ہیں۔'' ہر فطری شاعر کا ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ''سورداس، تلسی داس، ماہتاب کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ تو برج کے رسیا بھی تھے۔[2] مگر لطف تو یہ ہے کہ دکنی شعراء جن کی قدامت پسندی ادق بیانی کا اتنا چرچہ رہ چکا ہے اور اب بھی ہے وہ بھی اس میں اتنے ہی رچ بس گئے ہیں۔

☆دکنی شعروادب میں بھا کارس :

بھا کا بھاشا کا عوامی روپ ہے۔ اردو کو ہندی یا ہندوی کہا گیا ہے۔ برج اس کے مقابلے میں بھا کا کہلاتی ہے۔ اور بھاشا دورِ سوم (۶۰۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک) کے آخر تک شمالی ہند کی ہر اُس روزمرہ کی زبان کو کہا جاتا رہا ہے جس میں خاص کر اُس کے سُریلے نغمے گنگنائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ بھا کا بمعنی برج کی برج بھاشا کی پٹ ہے۔[3] بھا کا بمعنی زبان، بھا کا بمعنی راجستھانی، ان سب کا معیار آج بھی ہماری ادبی تاریخ کی آبرو ہے۔ بھرت وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے کہا تھا میٹھے بول بولو چاہے گاؤ شورسینی (برج) چھوڑ کسی اور کو منہ نہ لگاؤ۔[4]

بھا کا کے بول میٹھے ہوتے ہیں۔ دکنی شعروادب نے ''نقش ہائے رنگ رنگ'' میں قدامت پسندی کے اپنے فن کو رنگ لیا ہے۔ بھا کا ایک جھوٹا سا لفظ ہے ''سو'' بہت تراش خراش کیا ہوا ہشت پہل۔ اس لیے کہ اس کا مفہوم طریقۂ استعمال سے زیادہ تر واضح ہوتا ہے۔ مثلاً :

''قدرت کا دھنی سہی، جو کرنا ''سو'' سب وہی۔ خدا بڑا خدا کی صفت کرے کوئی کب تک''۔[5]

سب رس کے اس اقتباس کے بعد کلمۃ الحقائق کی عبارت ملاحظہ کیجیے :

''اللہ کرے 'سو' ہوے کہ قادر توانا توے کہا وقدیم القدیم اس قدیمی کا بھی کرنہار سہج 'سو' تیرا اٹھارو سہج توج تھے۔''[6]

اسی طرح شاعری میں یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

نہ پہونچے نہ پہونچا ہے گن گیان میں
''سو'' طوطی منجھ ایسا ہندوستان میں
(ملاوجہی)

دبی تھی ''سو'' آتش اوٹھی پھر سلگ
پڑیا دغدغے کی حرارت میں جگ[7]
(نصرتی)

دکنی ادب اردو ادب کے لیے تاریخی مواد کا ایک خزانہ ہے۔ دکنی ادب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ ''سو'' کلیدی رول ادا کر رہا ہے جس سے شعر میں ہلکی سی لے کے ساتھ اور سُر پیدا ہو رہا ہے۔ ادباء وشعراء نے غیر شعوری طور پر اس کا استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے فن کا کام لیا ہے۔ لفظ ''سو'' جیسے یک رکنی اور بھی ہیں جن کو بعد کے شعراء نے اپنے اشعار میں برتا ہے ''بن''، ''باج''، ''کچھ''، ''گیا''، ''آیوں''، ''دکھ'' اور ''جی'' وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

ترے سنگار کے ''بن'' میں تماشہ میں نول دیکھا
سروے کو جھاڑکوں نرل اناراں سے دو پھل دیکھا
(ہاشمی)

پیا ''باج'' پیالہ پیا جائے نا
پیا ''باج'' یک تل جیا جائے نا
(وجہی)

یہ خالص بھاکا کے بول ہیں یا پھر سنسکرت سے دیسی ہوئے اور بھاکا میں آئے ہیں ان الفاظ کو دکنی شعراء نے خوب صورتی سے اپنایا اور ان سے اپنے کو فن کو سنوارا ہے۔

کوئی حسن کا بندھن کتے
کوئی کچھ ''کتے''، کوئی کچھ ''کتے''
(ابوالحسن تاناشاہ)

شعر میں لفظ ''کچھ'' سے شعر کی معنویت بدل گئی۔ اس طرح کوئی کچھ کی تکرار سے Rythm پیدا ہو رہا ہے جس سے ایک پیکر بن رہا ہے، ''کوئی کچھ'' کا ماخذ ''سنسکرت''، ''کچ چت'' (کتاچت) ہے لیکن ''کچھ'' جو برج اودھی وغیرہ میں ہے اس کی اصل غالباً کچت ات اور ''کچھ'' کا کچھ کے آخر سے لیا گیا ہے۔[۸] لفظ ''دکھ'' کی طرف ذہن منتقل کرتے ہوئے شعراء نے اس طرح اپنی فنی وفکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

مگر کھولے خدا وے، ''دکھ'' دکھاوے اس سرج کا مکھ
اندھای نین یادیں سکھ تو مجھ پر ''دکھ'' رہا ہے نا
(قلی قطب شاہ)

برہے کہ ''دکھ'' کنک میں یوں نپٹ ردھائیں
تو اپنے عاشقاں میں سو دھن مجے گتی ہے

یہ شعر حضرت محمود دریائی کی ہندی نظم سے ہے اور اپنے پورے سنگار رس کے ساتھ جلوہ گر ہے۔[۹]

''صاحب'' یقیناً عربی سے فارسی، فارسی سے تصوف اور تصوف سے کی راہ سے بھکتی کیرتن تک پہنچا دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

''صاحب'' جمالاں یاد جب تج حسن کا کرتے نمک
لاجوں تھے گل جا آپنا ظاہر کرن ڈرتے نمک
(غواصی)

بالی سروپ سودھن جو پوتلی نین میں
''صاحب'' جمال ایسے مہکے نہ کوئی لنگن میں
(خیالی)

بھاکا کا یہ لفظ ''صاحب'' محبوب کے لیے برتا گیا ہے پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ زور اس پر نہیں کہ یہ لفظ کہاں کہاں پہنچا، دو یا دو سے زیادہ ادبی زبانوں یا عوامی بولیوں میں لغات کا مشترک ہونا بڑی بات ہے۔ کلاسیکل شعراء نے اور سنت شعراء نے بھاکا کی طرح چند لغات مشترک کو اپنے کلام میں برتا تو کم یا زیادہ کسی نے نہیں کیا۔ یہی ان کے فن کی اختراع ہے۔ کچھ، وہ، کیوں، کوئی، جیسی صورتوں کے علاوہ بھی ''آوے''، ''پاوے''، ''جائے''، ''ہوے گا''، جن میں دکنی ادب کا رس غنائی تن من میں رچا بسا ہوا ہے۔ سُر لے، میں ڈھلے وہ بول جو کلاسیکل شعراء کے لسانی دائرے کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ جیسے۔

نین تجھ مد بھرے دیکھت نظر میانے اثر ''آوے''
آدھر کے یاد کرنے میں زبان اوپر شکر آوے
(مشتاق)

یادو پیالی پریم اپس کے بھر بھر مت ''پلاوے''
جا کوئی طالب صادق اس کا وہ یہ رستا یاد ہے
(ظہوری)

گردوں کی جد گردش منے ''آوے گا'' ہر کوئی امتی
پڑھنے ضیافت مصطفیٰ آسان ہوں گے مشکلاں
(غوثی)

دکنی ادب ہندوستانی لفظوں کے تلفظ کی طرح ترنم میں بھی عوامی لب ولہجہ سے زیادہ قریب تر ہے۔ زبان کی مثال دریا کی سی ہے۔ منبع سے لے کر دہانے تک دریا کے سفر کا مشاہدہ بھی خوب ہے کہ منبع کے پاس دریا کی جو شکل ہوتی ہے دہانے تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل بدل جاتی ہے یقیناً دریا جب مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہے۔ وہ ان علاقوں کو بہت کچھ دیتا بھی ہے اور ان سے لیتا بھی ہے۔ اسی سے دریا کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دکنی زبان نے بھی اپنے شمالی منبع سے دکن میں بیجاپور اور گولکنڈے کے دہانے پر ایک معیاری بولی زبان کی منزل پر پہنچنے تک کسی اندیشے اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر نہایت فراخدلی اور وسیع النظری سے، مختلف پراکرتوں، اپ بھرنشوں اور مختلف زبانوں سے کچھ اخذ کیا۔ ایک زبان دوسری زبان کا اثر قبول کرتی ہے تو سہی نامیاتی صنعت اور اس کے پھلنے پھولنے کی دلیل ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے اس زبان کے خزینہ الفاظ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

☆

حوالے

(۱) سید کلیم اللہ حسینی۔ بلاغت۔ ص ۲۸
(۲) پروفیسر سرمد۔ سہ ماہی مجلّہ غالب۔ ۱۹۷۶ء، ص ۴۵
(۳) ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا آغاز۔ ص ۹۲
(۴) پروفیسر سرمد۔ سہ ماہی مجلّہ غالب ۱۹۷۶ء۔ ص ۲۹
(۵) ملا وجہی۔ سب رس۔ ۱۹۵۳ء، ص ۱
(۶) پروفیسر محمد علی اثر۔ بصارت سے بصیرت تک۔ ص ۴۷
(۷) پروفسر مجید بیدار۔ دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیت۔ ص ۵۸۰
(۸) ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا آغاز۔ ص ۲۶۲
(۹) ڈاکٹر اودھیش رانی۔ دکھنی زبان وادب پر دیگر ہندوستانی زبانوں وادب کے اثرات۔ ص ۱۲۳ ☆

Dr. Maimuna Begum saradgi
Department of Urdu
KBN University
Cell No : 8951312502
E-mail - saradgi@kbn.uniersity

☆☆☆

پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنّی و تجزیاتی مطالعہ

محبوب عالم (ریسرچ اسکالر)
یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد
موبائل نمبر: 9506713607

☆خلاصہ (Abstract)

جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے زمانۂ قیام سے ہی اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت کا مسکن رہا ہے۔ اس علم وادب کے گلہائے رنگارنگی سے پروفیسر شمیم حنفی کا خاص لگاؤ ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی عصرِ حاضر میں ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی 17 مئی 1939 کو اترپردیش کے ضلع سلطان پور میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ''محمد یسٰین صدیقی'' تھا۔ محمد یسٰین ایک معروف وکیل اور سماجی کارکن تھے۔ شمیم حنفی کی والدہ کا نام ''زیب النساء بیگم'' تھا۔ یہ ایک مشرقی تہذیب کی پروردہ اور پردہ دار خاتون تھیں۔

شمیم حنفی کا گھریلو ماحول ادبی وعلمی تھا۔ والدین نے ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا۔ انھوں نے اپنا بچپن سلطان پور میں اپنے گھر پر گزارا۔ شمیم حنفی کے والدین اور بھائی بہن انھیں 'شمی' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

شمیم حنفی نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والدین سے حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے شہر کے ایک اسکول ''مدھوسودن ودیالیہ'' سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ان کے والد نے انھیں الہ آباد بھیجا۔ جہاں انھوں نے بی۔اے اور ایم۔اے اردو ادبیات اور ایم۔اے (تاریخ) کی ڈگری حاصل کی اور پھر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے الہ آباد سے ہی ''پروفیسر احتشام حسین'' کی نگرانی میں ڈی۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ ڈیفل جو پی ایچ ڈی کا دوسرا نام ہے۔ اس ڈگری کے لئے شمیم حنفی نے ''محمد حسین آزاد'' پر مقالہ لکھا۔ شمیم حنفی کو اردو ادب میں ایک نقاد کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ اردو ادب میں ان کی تنقیدی کتابوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انہوں نے بیسیوں تنقیدی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی وتجزیاتی مطالعہ سرسری طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

تعارف *(Introduction)*

اردو ادب کی دنیا میں شمیم حنفی کا نام بطور ڈراما نگار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کی دنیا میں شمیم حنفی کا نام قابل تعظیم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس عہد میں ڈراما نگاری کی طرف توجہ کی، جب یہ صنف زوال پذیر تھی۔ شمیم حنفی نے صنف ڈراما کو ایک طرح سے دوبارہ زندہ کیا۔ انھوں نے صنف ڈراما کو نہ صرف مقبول عام کیا بلکہ سامعین کو اس کی قدر و قیمت کا احساس بھی دلایا اور نئے تجربہ کے ذریعے صنف ڈراما کو ایک نئی منزل اور ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔

شمیم حنفی نے ریڈیائی ڈرامے، اسٹیج ڈرامے اور ٹی۔وی ڈرامے لکھے ہیں۔ گویا شمیم حنفی نے سبھی قسم کے ڈراموں میں طبع آزمائی کی ہے۔ شمیم حنفی کا کہنا ہے کہ ڈراما اسٹیج کی چیز ہے اور ڈرامے کا اصل مقصد لکھا جانا نہیں بلکہ اسٹیج کرکے دکھانا ہوتا ہے۔ ڈرامے کارنامے نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذریعے قوم کے تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور جمالیاتی عناصر اجاگر کئے جاتے ہیں۔ برصغیر کے روایتی ڈراموں میں حقیقت نگاری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے ڈراموں میں فوق فطری کردار و واقعات ڈرامے کا اہم حصہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ ایک خاص ایشیائی مزاج اور ایک مخصوص طرز فکر ہیں۔ جس نے حقیقی زندگی کی گھٹن اور پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے اپنے آس پاس خیالی زندگی کا ایک جال بنا رکھا ہے جس سے وہ غمگین لمحات میں بھی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

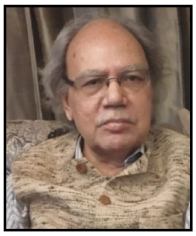

ترقی پسندی سے حقیقت نگاری کا آغاز ہوتا ہے اور ہر صنف ادب پر اس کے اثرات دِکھائی دیتے ہیں۔ شمیم حنفی کے تمام ڈراموں میں بھی حقیقت نگاری کی جھلکیاں صاف دِکھائی دیتی ہیں۔

☆پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی تجزیاتی مطالعہ :

شمیم حنفی جہاں ایک نقاد، سوانح نگار، تبصرہ نگار، شاعر، مترجم اور کہانی کار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں وہیں وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پانچ ڈراموں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں: (۱) مٹی کا بلاوا (۲) مجھے گھر یاد آتا ہے (۳) زندگی کی طرف (۴) بازار میں نیند (۵) آپ اپنا تماشائی۔

ان مجموعوں میں کل 23/ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ شمیم حنفی نے ابتدا میں فرمائش پر ڈرامے لکھے۔ 1968 سے پہلے لکھے گئے بہت سے ڈرامے جن کو وہ سنبھال کر نہیں رکھ سکے، ضائع ہو گئے۔ 1969 کے بعد لکھے گئے ڈرامے بھی کھو گئے جن میں سے ۱۱/ڈراموں کی نقلیں محمود ہاشمی کی وجہ سے ہاتھ آئیں جن میں سے چند اس کتاب (مٹی کا بلاوا) میں شامل ہیں۔ شمیم حنفی کے ریڈیو ڈراموں کو کافی شہرت ملی۔ انہوں نے اس وقت ڈرامے لکھے اور ریڈیو ڈراموں کے معیار کو بلند کیا جب اردو ڈراموں کا معیار بہت گر چکا تھا۔ بہت سی یونیورسٹیوں میں ان کے ڈرامے نصاب میں شامل ہیں۔ شمیم حنفی ریڈیو ڈراموں کی صنف سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ریڈیو ڈراموں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے بتایا :

''ریڈیو موسیقی مجھے بہت زیادہ پسند ہے، آوازوں سے مجھے بہت دلچسپی ہے۔ مجھے سناٹا بہت اچھا لگتا ہے۔ معمولی سے معمولی آواز بھی مجھے سنائی دیتی ہے، ایک پرندے کی آواز بھی ہوتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔ تو کہنا چاہئے Sensitivity چونکہ بہت زیادہ ہے اس وجہ سے میں نے اپنے آپ کو ریڈیو کے لئے بہت موزوں پایا اور یہی وجہ

ہے کہ ریڈیو کے لئے لکھنے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے۔''

''مٹی کا بلاوا'' شمیم حنفی کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔اس میں نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان خلیج، وقت کا تصادم اور مانوس قدروں کے مابین کشمکش اور ساتھ ہی قدیم فرسودہ روایت سے بغاوت ، اور دورِ حاضر کے مسائل کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں آزادی کے بعد ملک میں رونما ہونے والے تمام تہذیبی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور فکری ماحول کو موضوع بنایا ہے۔ترقی پسندی کے اثرات ان کے ڈراموں میں صاف نظر آتے ہیں۔انہوں نے خاص طور پر اپنے عہد کے سماجی مسائل کو موضوع بنا کر اپنے ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں جن مسائل کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے ان کے تعلق سے خود اپنے مجموعوں کے پیش لفظ میں وضاحت کر دی ہے۔انہوں نے اپنے ڈراموں کا موضوع زیادہ تر آج کے زوال آمادہ جدید انسان کو بنایا ہے۔انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ آج کا انسان اپنے فطری اور پُرسکون ماحول سے بہت دور نکل چکا ہے۔وہ شہروں کی بھیڑ میں ایک میکانکی زندگی گزار رہا ہے اسی لئے وہ انتشار و بے چینی اور بے حسی کا شکار ہے۔قدروں کے زوال کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا بھی زوال شروع ہو جاتا ہے۔انہوں نے اپنے ڈراموں کے موضوع کے متعلق تحریر کیا ہے :

''میرے ڈراموں کا ایک موضوع جو بار بار میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ انسان کا زوال کس طرح ہو رہا ہے اور یہ دنیا روز بروز کیسے زوال کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ زوال کا سلسلہ تیز کیسے ہوتا جا رہا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے، میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہوں، کبھی کبھی باہر نکلتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ دنیا جیسی بھی ہے اس میں شاید اپنے لئے جگہ نہ بنا سکا اور اس دنیا میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسانی سطح پر کوئی تعلق قائم رکھنا چاہو تو وہ بہت آسان کام ہے۔ میرے لئے کاروبار ایک Hyper Magnetic -Society- جیسی بنتی چلی جا رہی ہے۔''

شمیم حنفی نے فنی اعتبار سے مکمل ڈرامے لکھے ہیں۔ان کے ڈرامے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔شمیم حنفی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔انہوں نے زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔ان کا تعلق چونکہ متوسط طبقے سے رہا ہے اس لئے وہ ان کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے متوسط طبقے کے مسائل کو فنی چابک دستی کے ساتھ اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں فنی لوازمات کا بھرپور اہتمام کیا ہے۔ پلاٹ ہو یا موضوع کا انتخاب، کردار نگاری ہو یا مکالمہ نگاری، تصادم ہو یا کشمکش، نقطہ عروج ہو یا اختتام، سب عمدہ ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کے پلاٹ سیدھے سادے اور منظّم ہوتے ہیں۔آخر تک کہیں بھی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ واقعات ایک کے بعد ایک آگے بڑھتے ہیں۔شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں کا آغاز دلکش منظر کشی سے کیا ہے۔شمیم حنفی کو اسٹیج، ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے کی بھی تکنیک پر دسترس حاصل ہے۔

شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں۔ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے آس پاس ہیں۔شمیم حنفی کرداروں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جذبۂ محبت کو بھی انہوں نے بہت ہنرمندی اور فنکارانہ انداز میں اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔وہ جب بھی کوئی کردار پیش کرتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ ایک نئے جہان کی سیر کرتا ہے۔شمیم حنفی ڈرامے کی کہانی سے زیادہ کردار پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ جو کردار پیش کر رہے ہیں وہی کہانی بنائیں۔

کہیں کہیں ان کے ڈراموں کے کرداروں میں یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔جس کی مثال ڈراما ''مٹی کا بلاوا ''پانچویں سمت''، ''چوراہا'' اور '' اپنی اپنی زنجیر'' کے کرداروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔اس بارے میں خود شمیم حنفی لکھتے ہیں :

''میرے ذہنی سروکار، میرے ذہنی مسائل، میرے ذہنی تجربے، میری گرد و پیش کی دنیا، میرے مشاہدے کی دنیا وہ تو ایک ہی ہے تو کہیں کہیں آپ کو یکسانیت کا احساس تو ہوگا ہی.....''

شمیم حنفی کے ڈراموں میں مکالمہ نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے ڈراموں میں دلچسپ مکالمے لکھے ہیں۔کبھی دو نسلوں کے درمیان کشمکش، تو کہیں تہذیبوں کے درمیان، کشمکش، شوہر، بیوی، باپ اور ماں کے کردار سے انہوں نے خارجی اور داخلی تصادم کا کام لیا ہے۔

شمیم حنفی کے ڈراموں میں نقطۂ عروج بھی غضب کا ہوتا ہے۔انہوں نے قارئین کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں کے انجام تک تجسس کا بھی خاص خیال رکھا۔

☆ماحصل :

شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں فنی خوبیوں پر بھرپور توجہ صرف کی ہے۔مکالمے ہوں کہ کردار، جذبات نگاری ہو یا واقعہ نگاری، تصادم ہو کہ کشمکش، نقطۂ عروج ہو کہ انجام، ڈرامے کی تمام فنی لوازمات پر ان کی گہری نظر دِکھائی دیتی ہے جو ان کے مشاہدے اور تجربے کی ضامن ہے۔انہیں زبان و بیان پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ وحدتِ تأثر بھی شروع سے آخر تک ان کے سبھی ڈراموں میں نظر آتا ہے۔ان کے ڈراموں کے مطالعے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہ یہ اردو کے ایک کامیاب ڈرامہ نگار ہیں۔

☆کتابیات

(۱) مٹی کا بلاوا، شمیم حنفی
(۲) مجھے گھر یاد آتا ہے، شمیم حنفی
(۳) زندگی کی طرف، شمیم حنفی
(۴) بازار میں نیند، شمیم حنفی
(۵) آپ اپنا تماشائی، شمیم حنفی
(۶) اردو ہے جس کا نام، فاروق ارگلی
(۷) نعیمہ جعفری پاشا، شجر سایہ دار
(۸) سید خالد قادری، شمیم بھائی (شمیم حنفی): کچھ یادیں، کچھ باتیں

☆☆☆

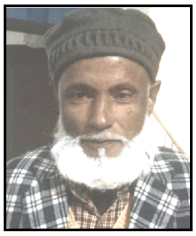

ماہنامہ گگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر۔ایک جائزہ

(آٹھویں قسط)

محمد احمد دانش روانوی (بجنور)
موبائل : 9759418047

صادق علی نے اپنے مضمون ''مسلمانوں کے معاشی مسائل'' میں مسلمانوں کے معاشی مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے تقسیم کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی ،زبان و ادب کلچر اور تمدن کی بیخ کنی کے سبب معاشی زبوں حالی کے اسباب کو گنایا ہے۔ جمال خیر گل نے اپنے مضمون ''مسلم نوجوانوں کا المیہ'' میں مسلمان طلبہ میں پروفیشنل مہارت کے ساتھ منصوبہ بند تعلیم کے حصول پر زور دیا ہے ۔ گہری اور مضبوط بنیادیں ،بلند اور مستحکم عمارتیں'' عنوان کے تحت خالد عرفان نے وقتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ تعلیم میں اصلاح ، معاشی و اقتصادی طور پر کمزور طلباء کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے سماجی ٹرسٹ کی تشکیل اور اوقاف کے صحیح و ایماندارانہ استعمال پر زور دیا ہے۔ نیشنل کیریکٹر کو مذہبی عمل داری سے دور رکھتے ہوئے سیکولر بنیادوں پر نیشنل کیریکٹر کی بقاء پر زور دیا گیا ہے۔

چوتھے کالم ''آب آب دھرتی'' میں مدیر گگن شمس کنول صاحب کا واحد مضمون ''کوئی مستقل نہیں تبدیلی کے سوا'' شامل اشاعت ہے جو ''مسلمان اور تشدد'' ''مسلمان اور جنگ آزادی'' ''فرقہ وارانہ فسادات'' ''اردو اور مسلمان'' اردو اور سیکولرزم'' رسم الخط کی تبدیلی'' ''ہندی اور علاقائی زبان'' ''غیر کی آگ میں مسلمان'' 'اسلام اور ہندوستانی مسلمان' 'اسلام اور معاشی مسائل' 'قرآن برحق ۔مگر' 'کوئی شئے مستقل نہیں۔' 'تم وقت کے دھاروں کا روکو گے سفر کب تک' 'میں کو تو ہم بنا' وغیرہ ذیلی سرخیوں پر پھیلا ہوا طویل مضمون ہے ۔جس میں مدیر موصوف نے مذکورہ بالا ذیلی عنوانات کے تحت اپنے مطمح نظر کو بیان کیا ہے۔

پانچویں کالم انجمن خیال میں مولانا الطاف حسین حالی کی نظم ''مدوجزر اسلام'' علامہ اقبال کی ''ساقی نامہ'' اکبرالہ آبادی' فضاالہ آبادی' مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی منظومات کے علاوہ طاہر مراد آبادی کی نظم ''صدائے خاتون'' جوش ملیح آبادی کی ''پیرانِ سالوس'' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی نظم '' پاکستانی عوام سے خطاب'' نیاز حیدر کی نظم ''مولوی'' ثاقت رتلامی کی نظم ''خطاب'' منظومات میں جہاں مسلمانوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے وہیں مذکورہ منظومات کے پیغامات کے بطون میں مذکورہ مسائل کے حل کو نشان زد کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہد و عمل کی بھی پرجوش تحریک دی گئی ہے۔

چھٹے کالم ''صحت گاہ عالم'' میں کے ایم یوسف نے ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ'' عزیز الرحمان جامعی لدھیانوی نے ''مسلمانوں کی تین سو باسٹھ سالہ قربانیوں کا تاریخی جائزہ'' 1508 تا 1947 کچھ اس تفصیل سے لیا ہے کہ اس میں' آغاز تحریک حریت ملک و ملت حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ 1505 (شاہ ولی اللہ اسکول) سے لے کر پہلی جنگ آزادی 1857 شہدائے 1857 شہداء کے ترکِ موالات ، پھانسیاں 1857 نظر بندیاں 1857 اور جلیاں والا باغ ، 1919 تا 1947 جلیاں والا باغ 1919 تا 1922 کے دیگر مجاہد ، مجاہدین آزادی 1929 تا 1947 آل انڈیا کانگریس کے مسلم صدر ،سربراہان جمعیۃ علمائے ہند 1919 تا 1940 دیگر مسلم جماعتیں جن میں خلافت کمیٹی ، 1919 تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ 1920، کابل کانفرنس 1922 خدائی خدمت گار 1924، مومن کانفرنس 1925 مجلس احرار 1929 کشمیر نیشنل کانفرنس 1930 شیعہ پولیٹیکل کانفرنس 1930، انجمن وطن بلوچستان 1934، آل انڈیا مجلس 1940، مجلس احرار ہند کے ہائی کمان 1919--1947، جمعیۃ علماء کے ہائی کمان 1919--1947، اسیران فرنگ مجلس احرار 1929 تا 1947، اسیران فرنگ مجلس جمعیۃ علماء 1929 تا 1947 شاعر اور صحافی ،ادبی اور قلمی مددگار وغیرہ ذیلی عنوانات پر پھیلا تفصیلی و تاریخی نوعیت کا حامل مضمون ہے۔ تاریخ ہندوستان 6/ہزار برس قبل مسیح سے 20/صدی عیسوی تک کا ترتیب وار اشاریہ دیا گیا ہے جو خاص اہمیت کا حامل ہے۔

کرار حسین نے ''ہندوستانی مسلمانوں کے تیوہار'' ڈاکٹر اے حلیم کا مضمون 'ہندوستانی موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ' خواجہ عبدالغفور کا مضمون 'مسلمان اور مزاح' امداد صابری کا مضمون 'ہندوستان میں خبر رسانی کے ذرائع ابتداء سے آج تک' کے علاوہ غدر سے قبل کے اخبارات کی فہرست' دنیا کے مسلم ممالک کی فہرست و (رقبہ۔آبادی۔زبان) اردو کے آٹھ سو برس' مسلم قیادت وغیرہ مضامین کی اشاعت سے مذکورہ کالم میں مسلمانوں کی تاریخ کے اجمالی جائزے کے ساتھ جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار' مسلمانوں کے علمی ،ادبی ،تہذیب وفنون ،تمدن و کلچر جیسے پہلوؤں کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔(جاری)

انار رُمّان ۔ بہترین صحت کا ضامن

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر
(قومی اعزاز یافتہ ٹیچر) صدر شعبہ نباتیات،
مولانا آزاد کالج اورنگ آباد۔ (مہاراشٹر)
موبائل: 9422211634

مختلف نام: انار کو انگریزی میں Pomegranate، مراٹھی میں ڈالمب، عربی میں رُمّان کہتے ہیں۔ فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی میں انار کہتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام : *Punica granatum* Linn. ہے۔ اس کا خاندان Punicaceae ہے۔

انار کا قرآن شریف میں تذکرہ: قرآن شریف میں انار کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت نمبر 141 میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ أَنشَأَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوشٰتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشٰتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفاً أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهاً وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُواْ مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُواْ حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (141)

"اور اللہ ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کئے، چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو (بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (بعض باتوں میں) نہیں ملتے جب یہ چیزیں پھلیں تو اُن کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو اللہ کا حق بھی اُس میں سے ادا کرو اور بے جا نہ اڑانا کہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس کے علاوہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر 100، سورۃ الرحمٰن کی آیت نمبر 67-68 میں انار کا تذکرہ ہے۔

انار کی پہچان: انار کا درخت پانچ سے دس فٹ تک بلند ہوتا ہے۔ اس کے پتے سبز رنگ کے نیزے کی شکل کے ہوتے ہیں جن کی لمبائی تین انچ تک ہوسکتی ہے۔ اس درخت پر نارنجی سرخ رنگ کے خوبصورت پھول لگتے ہیں۔ ان پھولوں کا رنگ اور شکل کی بنیاد پر ایک رنگ 'گلناری' بہت مشہور ہوگیا ہے۔ عام طور سے گرم اور خشک موسم میں اس پر پھل لگتے ہیں۔ ہندوستان میں انار کی تقریباً بارہ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لحاظ سے اس کے الگ الگ نام ہیں۔

انار کی دستیابی: ماہر نباتیات ڈی کینڈولے کے مطابق انار کا اصل وطن ایران ہے۔ آج کل دنیا کے مختلف ممالک میں اس کی کاشت پھل کے لئے کی جاتی ہے۔ اورنگ آباد ضلع میں چکل ٹھانہ، کرماڑ، کاغذی پورہ، پیٹھن، خلد آباد کے علاوہ مرہٹواڑہ کے مختلف اضلاع جیسے جالنہ، پربھنی، ناندیڑ، بیڑ، عثمان آباد، لاتور وغیرہ میں بھی اس کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔

انار کے خواص: انار ایک حیرت انگیز اور نایاب پودا ہے۔ پھل سمیت اس کے ہر حصے کے طبّی فوائد ہیں۔ انار کا پھل غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے اس لئے علاقے کے کچھ لوگ انار کے دانوں کو طبّی غذا یا طبّی پھل بھی کہتے ہیں۔ انار کے پھل میں بڑی مقدار میں شکر (گلوکوز و فرکٹوز) کے علاوہ ہمہ اقسام کے حیاتین موجود ہوتے ہیں جن میں خاص طور سے تھامائن اور رائبوفلیوین، وٹامن سی یعنی اسکوربک ایسڈ بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ فاسفورس، سوڈیم، کیلشیم، سلفر، آکزیلک ایسڈ اور کیروٹین انار میں کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ انار کے دانوں کا رس فرحت بخش غذا ہے جو دل کے امراض میں بہت فائدہ مند ہے۔ میٹھا انار قبض کشا ہوتا ہے جبکہ تھوڑی سی کھٹاس والے انار کے دانے معدے کے ورم اور دل کے درد کے لئے لاجواب دوا اور ٹانک ہے۔

انار کے طبّی استعمال: اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ نعمتوں میں انار ایک بڑی نعمت ہے جس کے بابت خدائے برتر سورۃ الرحمٰن میں فرماتا ہے کہ "ان میں میوے اور کھجوریں اور انار ہیں۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ انار کا پھل دل و دماغ کو اس حد تک فرحت و تازگی بخشتا ہے کہ ایک پیغمبرانہ قول کے مطابق اس کے

استعمال سے انسان میں نفرت اور حسد کا مادّہ زائل ہوجاتا ہے۔ انار کے درخت کے تمام حصے مثلاً جڑ، تنہ، پتے، پھول اور پھل طبّی نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں۔ راقم الحروف نے ضلع کے مختلف حصوں میں اس کے مختلف اعضاء کے الگ الگ استعمال کا مشاہدہ کیا۔ کنڑ کے ایک دیہات میں انار کے درخت کی چھال کے جوشاندے سے غرارہ کر کے حلق کے ورم سے نجات دلائی جاتی ہے۔ انار کا رس اسہال یا خونی پیچش میں مبتلاء مریضوں کے لئے بہترین علاج ہے۔ یہ کمزوری رفع کرنے کا طریقہ بھی ہے۔ خون کی کمی، یرقان، بلڈ پریشر، بواسیر کے علاوہ ہڈیوں اور جوڑوں کے درد میں انار کا استعمال یونانی، آیورویدک اور ایلوپیتھی میں کیا جاتا ہے۔ انار کے درخت کے جڑ کی چھال کو پانی میں ابال کر مریض کو پلانے سے مریض کے پیٹ میں موجود سارے کیڑے مر جاتے ہیں۔ نسوانی امراض میں انار کے جڑ کی چھال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے حاصل کیا گیا جوشاندہ نسوانی شکایات میں دھلائی (Wash) کے لئے بیحد مفید ہے۔ انار کے پھل کا چھلکا ابال کر پلانے سے پرانی پیچش کے مریض کو فوراً افاقہ ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ انار کا استعمال مختلف امراض جیسے امراض چشم، امراض قلب، چہرے کی بے رونقی، معدے کے امراض، حاملہ کی متلی، خون کا سرطان، ہاتھ پاؤں کی جلن، پیچش، بواسیر وغیرہ کے علاج میں انتہائی فائدہ مند ہے۔

حضرت انس بن مالک ابونعیم روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے انار کے بارے میں پوچھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کوئی انار نہیں ہوتا جس میں جنت کے اناروں کا دانہ شامل نہ ہو۔ ☆☆☆

شہر اورنگ آباد میں 'افسانچہ نگاری' کا رجحان ___ ایک اجمالی جائزہ

قسط چہارم

ڈاکٹر عظیم راہی (اورنگ آباد)
موبائل : 9370992203

۲۰۰۸ء میں 'اردو میں افسانچہ کی روایت' کے نام سے اردو افسانچہ پر عظیم راہی کی پہلی تحقیق وتنقیدی کتاب شائع ہوئی جو اردو میں اس موضوع پر پہلی باقاعدہ تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اس کے بعد ۲۰۱۵ء میں دوسری کتاب 'اردو میں افسانچہ کی مقبولیت اور پیش رفت' کے عنوان سے اس موضوع پر شائع ہوکر اردو افسانچہ نگاروں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کتاب میں اردو کے اہم اور ابھرتے ہوئے افسانچہ نگاروں پر تفصیلی مضامین اور تبصرے شامل ہیں۔ ۲۰۲۰ء میں عظیم راہی کے افسانچوں کا تیسرا مجموعہ 'کل اور آج کا غم' شائع ہوا۔ اس مجموعہ پر بھی بڑی تعداد میں ادبی رسائل میں تبصرے ہوئے اور مجموعے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم خان لکھتے ہیں :

'' ڈاکٹر عظیم راہی ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وقت کی ضرورت اور انسانی فطرت کے خلاف بیجا مزاحمت پر توانائی صرف کرنے کے بجائے افسانچوں کے صنف ادب کی زلفوں کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا اور اسے نئے آفاق کی سیر کرائی۔ عام طور افسانوں کے مجموعہ میں ڈیڑھ دو درجن کہانیاں ہوتی ہیں جبکہ افسانچوں کی کتاب مرتب کرنے کے لیے سوڈیڑھ سو افسانے درکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوں کے مقابلہ افسانچوں کے مجموعوں کی تعداد قدرے کم ہوتی ہے۔ چند سطور کے اندر اپنا مدعا بیان کر دینا ایک دقت طلب امر ہے۔ اس کے لیے فنکار کا غیر معمولی صلاحیت سے معریٰ ہونا لازمی ہے۔ چند افسانچے لکھ دینا کسی بھی افسانہ نگار کے لیے مشکل نہیں ہے مگر افسانچوں پر یکے بعد دیگرے تین مجموعے شائع کروا دینا یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی کے افسانچے مقدار کے علاوہ معیار کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں۔'' (مطبوعہ سہ ماہی 'اسباق' پونہ ۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء ص ۱۲۳)

رفیق جعفر اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

'' آج ادبی دنیا میں جہاں بھی افسانچہ کی بات ہوتی ہے عظیم راہی کے افسانچے موضوعِ گفتگو ہوتے ہیں۔ اسکالرس ان کے افسانچوں کے حوالے دیئے بغیر اپنا مقالہ پورا نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے آج کے فکشن کے عظیم مصنف نورالحسنین نے انھیں اس کتاب کی اجراء کے موقع پر 'بابائے افسانچہ' کے خطاب سے نوازا ہے۔''

(مطبوعہ ماہنامہ 'ایوان اردو' دہلی۔ جون ۲۰۲۲ء ص ۷۰)

آگے رفیق جعفر اس مجموعہ کے افسانچوں کے موضوعات کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

''عظیم راہی افسانچہ شناس انسان ہیں انھوں نے افسانچوں کی ہیئت کے تجربے کرتے کرتے اپنے لئے ایک فنی اظہار کو اپنا لیا ہے جس کا ثبوت ان کا تیسرا افسانچوں کا مجموعہ 'کل اور آج کا غم' ہے۔ اِس مجموعہ کے افسانچوں پر نظر ڈالیں تو یہ افسانچے بیسویں صدی کے آخری دہے سے لے کر اکیسویں صدی کے دو دہوں کی سماجی زندگی کو درشاتے ہیں۔ انسان سے انسان کی دوری' نفسانفسی' ریاکاری' خودغرضی' تجارتی ذہنیت' بے حسی' بے بسی' معاشرتی ترقی کے نام پر معیار زندگی کی گراوٹ' رشتوں کی شکست وریخت ایسی سچائیوں کو قلم کی گرفت میں لانا اور آئینہ دکھا کر احساس دلانا فنکاری ہی تو ہے۔ یہ فنکاری عظیم راہی کے افسانچوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔''

(مطبوعہ ماہنامہ 'ایوان اردو' دہلی۔ جون ۲۰۲۲ء ص ۷۰)

نورالحسنین ممتاز جدید افسانہ نگاروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار' ڈرامہ نگار' خاکہ نگار اور ناول نگار ہیں اور وہ ریڈیو فیچر نگاری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے بہترین افسانچے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کئی ڈائمنشن ملتے ہیں اور علامتوں کا استعمال بھی وہ خوب کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانچوں میں بھی اس جدت کو بڑی ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں :

'' افسانچہ میں کہانی' فلسفہ' تاریخ' واقعہ سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ اس وقت اور بھی دلکش ہوجاتا ہے جب اسے تلمیحات اور استعاروں سے مزین کر دیا جائے۔ میرے افسانچے آپ کو یہ سب تاثر دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جہاں اپنے افسانوں پر بھرپور اعتماد ہے وہیں افسانچوں پر بھی۔''

لیکن اس اعتماد کے باوجود انھوں نے اپنی افسانچہ نگاری پر اس قدر دھیان نہیں دیا' جس کی یہ صنف مستحق ہے۔ بہرحال اِس عدم دلچسپی کے باوجود ان کے پاس بہت اچھے افسانچے ملتے ہیں۔ جو بقول ان کے تلمیح' علامت' استعارہ سے ہم آہنگ ہو کر افسانچے کے فن کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں۔ بہت پہلے انھوں نے 'چنگاریاں' نام سے اپنے افسانچوں کا مجموعہ ترتیب دیا تھا۔

(جاری)

ISSN 2320-6519
AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

''قصے قدیر سیفی کے'' (سیفی نامہ)

(ایک وعدہ اور وصیت کے ضمن میں)

● سہیل بیابانی (اورنگ آباد) (گذشتہ سے پیوستہ)
موبائل : 9422658879

مشاعرہ کے شرکاء میں قابل ذکر راہی قریشی ، جے پی سعیدؔ، نورالباسط نور، عباس انجم، جاوید اختر ، رؤف انجم اورنو وارد استاد محترم جناب عصمت جاوید صاحب نے مشاعرہ میں حصہ لیا۔شہر کے شاعروں اور ادیبوں کی آراء حاصل کرنے کے لئے قدیر سیفیؔ گھر گھر پیدل گئے ،انھیں سائیکل چلانا نہیں آتا تھا۔

۱۹۶۸ء کے فساد میں اُن کے چچازاد بھائی شہید ہوئے تھے۔اسی دوران قدیر سیفی آزاد اسکول میں پیشہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔اُن دنوں کوئی مقامی اخبار نہیں نکلتا تھا۔کلیم راہی ، جاوید اختر ، عبدالحمید شاکر ، قدیر سیفیؔ اور راقم الحروف ممبئی کے اخبارات روزنامہ ہندوستان، آشکار، آج ،اردو ٹائمز وغیرہ میں چھپنے لگے۔

۱۹۷۵ء میں قدیر سیفیؔ نے اردو ایم اے میں داخلہ لیا۔ اس طرح وہ دوبارہ میرے ہم جماعت ہوگئے۔نگراں ڈاکٹر سید نعیم الدین پرنسپل گورنمنٹ کالج تھے۔اس دوران ایم اے اردو کی بزم اردو ادب کا افتتاح سکندر علی وجدؔ کے دست مبارک سے کروایا گیا۔سیفی صاحب بزم کے صدر، ناچیز معتمد۔

اُن دنوں وجدؔ صاحب کا قیام اورنگ آباد کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ہم طلبہ دعوت نامہ دینے کی غرض سے گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ہمیں اُن کی تنک مزاجی کا علم تھا۔اس موقع پر قدیر سیفی کی جسارت کام آئی۔ انہوں نے دعوت نامہ دے کر اپنا تعارف کروایا۔وجدؔ صاحب نے دعوت نامہ پڑھ کر خوشی کا اظہار کیا اور شرکت کی آمادگی ظاہر کی اور پانچ بجے انھیں لانے کی غرض سے ہم طلبہ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ وہ ہمارا ہی انتظار کررہے تھے۔

جلسہ گاہ کی یہ حالت تھی کہ کوئی بھی مہمان حسب معمول وقت پرنہیں آیا تھا۔وجدؔ صاحب کو تیار دیکھ کر ہم گھبرا گئے اور وقت گزارنے کی خاطر کہنے لگے کہ آپ کی سواری کا بندوبست کرتے ہیں۔وجدؔ صاحب نے فوراً کہا کہ نہیں نہیں کوئی بات نہیں میرا ہی کالج ہے پیدل ہی چلے گا۔وجدؔ صاحب آکاشوانی کی ریکارڈنگ کے لئے گاڑی کا مطالبہ کرکے ہمارے پروگرام کے لئے پیادہ پا چلنے راضی ہوگئے،خوشی ہوئی اور ہمارے قدم گیسٹ ہاؤس سے نکل کر ہاسٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہنے لگے اوپری منزل کے کمرہ نمبر ایک میں میرا قیام رہا کرتا تھا۔دورانِ گفتگو قدیر سیفی کہنے لگے میرے تایا بھی اسی ہاسٹل میں رہتے تھے وہ جالنہ کے سیشن جج تھے۔وجدؔ صاحب دخل درمعقولات پر چلتے چلتے رک گئے،چشمے کے پیچھے سے گھورا: اچھا کہا۔اور پھر اپنے مخصوص انداز میں چلنا شروع کردیا۔ راستے میں کالج پہنچنے تک پنڈت نہرو سے اپنے دیرینہ مراسم اور اندرا گاندھی کے زمانے میں ''بیاض مریم'' شعری مجموعہ کی روداد سنائی۔

توصیفی خطبات کے ضمن میں شعبہ اردو نے آل احمد سرور کو مدعو کیا تھا۔اُن کی آمد سے استفادہ کرتے ہوئے جوگندر پال کی صدارت میں ایک نشست رکھی گئی تھی۔اس نشست میں عصمت جاوید، یوسف عثمانی ، بشرؔ نواز اور رعنا حیدری وغیرہ نے کلام سنایا۔نوشق

شعراء میں لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔بشر بھائی نے کہا:اور کسی کو کلام سنانا ہے؟ سامعین میں سے فوراً نکل کر قدیر سیفی آگے بڑھے ، اپنی ایک نظم سنائی ، اُن کی جرأت دیکھ کر ہم سب دنگ رہ گئے۔

قدیر سیفیؔ کی جسارت کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔شہر میں نوتعمیر شدہ وجدؔ میموریل ہال میں رفعت نواز نے اپنا افسانہ سنایا۔اظہار خیال کے لئے سامعین کو دعوت دی گئی۔مائک کی خرابی کی وجہ سے سامعین کو افسانہ برابر سنائی نہیں دیا۔ اُس کے باوجود قدیر سیفیؔ نے اظہار خیال کیا۔سامعین میں سے کسی نے کہا:وہ تو بغیر افسانے سنے بھی اظہار خیال کرسکتے ہیں۔بے شک وہ آتش نمرود میں کودنے کے لئے تیار رہتے تھے۔انہوں نے نظم اور نثر میں کافی طبع آزمائی کی۔وہ ادب میں چومکھی چال چلتے رہے۔انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد (بزم اردو) بنائی لیکن اُسے زیادہ مصلیان نہ مل سکے۔خود احتسابی کے فقدان اور شاگرد بے اتالیق کی نگارشات وہ مقام نہ پاسکی جس کی وہ حقدار تھیں۔ ایسا لگتا ہے کچی پکی ہانڈی کی ضیافت کرنے میں انھیں لذت ملتی تھی۔

کاش کہ سیفی صاحب حالیؔ کے زمانے میں پیدا ہوتے تو جاگیرداری نظام میں اُن کی قدر بھی ہوتی۔یہ ہیرا ناتراشیدہ کسی جوہری کے ہاتھ لگتا تو اس کے آب و تاب کا کیا کہنا۔انھیں تمام عمر ملال رہا کہ اُن کی ناقدری کی جارہی ہے۔اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔نہرو بھون میں جاوید ناصر کی رحلت پر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی نظامت پروفیسر عسکری کررہے تھے۔قدیر سیفی صاحب بھی اظہار خیال کرنا چاہتے تھے لیکن عسکری صاحب انھیں بھول گئے۔اس

حرکت سے سیفی صاحب بیحد ناراض ہوئے۔صدارتی کلمات شروع ہوتے ہی وہ حال سے برہم باہر نکل آئے۔صدیق وقار اور میں انھیں سمجھاتے رہے۔آج تو خان پٹھان کی شمشیر برہنہ میان کے باہر نکل آئی۔شاید انھوں نے اسی نسبت سے سیفی تخلص اختیار کیا تھا۔انہوں نے غصے میں کہا کہ یہ لوگ ہر وقت مجھے نظر انداز کرتے ہیں۔ ہانپتے ہوئے، غصے میں کہا: میری ناقدری ہوتی ہے، سہیل صاحب تم وعدہ کرو، میرے مرنے کے بعد تم مضمون لکھوگے۔اور میں نے وعدہ کر کے اُن کے غصے کو کافور کیا۔اُس وقت ایک پٹھان کا جاہ و جلال دیکھنے کو ملا۔افغانی پٹھان افغانستان میں تلوار بھول آئے تو کیا ہوا اُس کا جاہ و جلال تو اُس کے مزاج میں باقی رہے گا۔ بہ حیثیت انسان قدیر سیفی بڑے ملنسار، بامروت، مہمان نواز تھے۔کسی کے گھر تسمیہ خوانی میں جائیں گے تو پھول اور مٹھائی ضرور لے جائیں گے۔ بیٹی کے گھر جائیں گے تو خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔

اُن دنوں پرائمری اساتذہ کو تین تین مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔لیکن اُن کی وضعداری اور معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔اُن کی مروّت اور بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی مالی اعانت کا فارم مجھے درکار تھا۔خود کے لئے منگایا ہوا فارم مجھے دے دیا۔اس قدر خوددار، باحوصلہ شخص کہ نامساعد حالات ہونے کے باوجود کبھی کسی کے سائے دست طلب دراز نہیں کیا اور نہ ہی مالی دشواریوں کا اظہار کبھی کیا۔وہ تو مرمر کے جئے جانے کے ہنر کو خوب جانتے تھے۔عمر بھر راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔محدود آمدنی کے باعث انھوں نے کبھی ٹیوشن، تو کبھی حکومت ہند کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں سروے کا کام کیا اور کبھی جزوقتی لیکچرر سرسید کالج میں بھی رہے۔گویا کے جی سے پی جی تک پڑھایا۔کبھی بھی اپنے آپ کو انہوں نے پروفیسر نہیں کہا ورنہ آج کے پارٹ ٹائم جونیئر لیکچرار بھی اپنے آپ کو پروفیسر کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

سیفیؔ تخلص سے یاد آیا، یونیورسٹی میگزین میں اُن کے نام کے ساتھ سیفیؔ کی جگہ کیفی ہوگیا تو وہ کافی برہم ہوئے۔ نام کے ساتھ ان کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی۔آکاشوانی کے پہلے نشریہ میں ان کا نام عبدالقادر خان نشر کردیا گیا تھا۔ وہ اپنی نگارشات جب بغرض اشاعت دیتے تو نام کے ساتھ ادیب، شاعر، انشاء پرداز، ریڈیو آرٹسٹ لکھتے۔اُس پر کاتب صاحب شوخی شرارت سے وغیرہ کا اضافہ کرتے۔انھیں کیا معلوم تھا کہ سیفیؔ صاحب شاعر، ادیب، انشاء پرداز ریڈیو آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ حج کرنے کے بعد الحاج مفسر قرآن بھی ہوگئے تھے اور رشید پورہ کی مسجد میں درس قرآن دیتے تھے۔اس لحاظ سے وہ شاعر، انشاپرداز، استاد، مدیر، مفسر قرآن، الحاج وغیرہ بھی کہلائے جاسکتے ہیں۔افسوس انھیں آج کے زمانے کی ادبی مارکیٹنگ نہیں آتی تھی۔وہ تو بس بھولا بھالا معصوم سا پٹھان بچہ تھا۔

میں ماضی کے دھیان کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ قیصر صاحب کے فون نے میرے قلم کو روک دیا۔ انھوں نے قدیر سیفیؔ کے انتقال پُرملال کی اطلاع دی اور کہا کہ بعد نماز عصر مینارہ مسجد میں نماز جنازہ ہے۔ جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوا، شکر ہے کہ اُن کی حیات میں روزنامہ ''اورنگ آباد ٹائمز'' میں ان کے متعلق مخصوص گوشہ شائع ہوا۔اس سے قبل کچھ عرصہ پہلے رسالہ ''عکس ادب'' (سہ ماہی) نے مخصوص گوشہ بھی نکالا تھا۔فون کے بعد میں مسجد کی طرف چل پڑا۔ابھی جنازہ نہیں آیا تھا۔مسجد کے صحن میں قدیر سیفیؔ کے برادرِ نسبتی سید عطاءاللہ شاہ، کاظم علی ہاشمی، ندیم فردوسی، سعید زیدی حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ وجاہت قریشی انتظار میں ٹہل رہے تھے۔صدیق وقار، سمیع الدین اطہر، مختار خان، اظہر شکیل، نوید صدیقی وغیرہ بھی نظر آئے۔ جاوید حسن خان کے ساتھ خان مقیم خان کھڑے کہہ رہے تھے، واٹس اپ کے زمانے میں کم وقت میں تمام واقف کاروں کو اطلاع دے دی گئی تھی، چلو بیچارے کی آخری خواہش پوری ہوئی۔اس لئے جنازہ میں کثیر معزز شہریان، شاعر، ادیب شریک ہوگئے۔

بچپن میں ایک مولوی صاحب نے جس گورے چٹے لڑکے کو مدرسے میں شریک کیا تھا۔آج اُسے تقریباً پچاس سال بعد کئی بزرگ حضرات ہاتھوں ہاتھ کاندھے بدل بدل کر مسجد کی طرف آرہے تھے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اُن کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین۔صحیح بات تو یہ ہے کہ ایسے لوگ بار بار دیکھنے کو کہاں نصیب ہوتے ہیں ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
عاشقِ اردو مر گیا باغِ اردو اداس ہے

☆☆☆

غزل

خلیل صادق

بھولی ہوئی نہ یاد کرو اب کہانیاں
عہد شباب اور وہ بیتی جوانیاں

جوشِ جنوں بھی سرد ہے اور آہ نارسا
اب موج خون میں بھی نہیں وہ روانیاں

جاتے ہو کہیں اور بتاتے ہو کہیں اور
سیکھی ہیں خوب تم نے یہ باتیں بنانیاں

نامے میں نام لکھ دیا میرے رقیب کا
الفت کہاں ہے، یہ تو ہے نفرت کی بانیاں

صادقؔ کرو نہ یاد نہ آئے گی اب کبھی
دل کی امنگ اور وہ راتیں سہانیاں

برمحل اشعار اور ان کے ماخذ

(چھٹی قسط)
خلیق الزماں نصرت (بھیونڈی)
موبائل : 9923257606

میر تقی میرؔ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
(کلیاتِ میر۔ص۱۰۷)

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئے آرام کیا
(بیت بازی۔ص۷۳، کلیاتِ میرؔ۔ص۱۰۷)

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
(علم مجلسی۔ص۹۲، کلیاتِ میرؔ۔ص۱۰۷)

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۰۸)

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
(شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے)
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۱۰)

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(گلستان۔ص۶۵، کلیاتِ میرؔ۔ص۲۱۰)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی
(کلیاتِ میرؔ۔ص۴۶۳)

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں
(گلستان ہزار۔ص۴۷، کلیاتِ میرؔ ص۵۶۷)

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
(کلیاتِ میر۔ص۱۰۸)

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے
(بیاضِ سخن۔ص۲۰۲، کلیاتِ میرؔ۔ص۱۷۸)

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۷۸)

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں
(کلیاتِ میرؔ۔ص۴۲۹)

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
(کلیاتِ میرؔ۔ص۲۹۲)

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۵۱۱)

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۳۶۲)

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۲۸)

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۲۸)

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا
(گلستان۔ص۹۵، کلیاتِ میرؔ۔ص۳۶۱)

ہم سے دیوانے پھریں، شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے
(نکات الشعراء۔ص۱۵۸، کلیاتِ میرؔ۔ص۲۹۶)

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۳۰)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
(کلیاتِ میرؔ۔ص۷۶۰)

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
(گلستان ہزار۔۱۰۷، کلیاتِ میرؔ۔ص۱۲۶)

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
(کلیاتِ میرؔ۔ص۲۵۲)

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۷۷)

ایک عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا
(کلیاتِ میرؔ۔ص۱۰۱۶)

(جاری)

☆☆☆

شاعری (غزلیات شعرائے پربھنی مع تعارف)

سید سلطان حسینی سالبؔ

سید سلطان حسینی نام اور سالبؔ تخلص تھا۔ ۱۶/اکتوبر ۱۹۴۱ء کو پربھنی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید احمد تھا۔ وہ اپنے آبائی وطن بیڑ سے پربھنی تشریف لائے اور یہیں بس گئے، پیشہ سے معمار تھے۔ سالبؔ نے تعلیم ہفتم جماعت تک حاصل کی اور اس زمانے کے مطابق پیشہ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ کلمنوری، پربھنی وغیرہ مقامات پر معلّمی کے فرائض انجام دیئے۔

بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ ہزل کی صنف میں اپنا ایک منفرد فن ایجاد کیا۔ اس طرح ہزل کہنے والے نمائندہ شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ نہایت ہی خوش مزاج، ملنسار اور وضع دار آدمی تھے۔ اس کے علاوہ عملیات بھی کیا کرتے تھے جس میں خدا نے انھیں دستِ شفاء عطا کیا تھا۔ ایسے کئی مریض ہیں جو شفایاب ہوئے۔ آپ کو کئی کل ہند مشاعرے پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ''سالبیات'' آپ کا شعری مجموعہ ہے۔ سالبؔ کا انتقال ۲۷/دسمبر ۱۹۸۱ء کو پربھنی میں ہوا۔

●

آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تری رہ گزار میں
بیٹھا ہوں بے نیاز جہاں انتظار میں

دامن ہے اشک خوں سے مرقع بہار کا
گویا پروئے ہیں گُلِ نو تار تار میں

اختر شماریوں میں گزرتی ہے ساری رات
آجائے وہ کبھی تو دلِ داغدار میں

کی گالیوں کے بعد محبت کی گفتگو
حلوہ ملا کے مجھ کو کھلایا اچار میں

بُلبُل لپٹ کے پھول سے روئی ہے اس لیے
سالبؔ کو موت آئی ہے فصلِ بہار میں

☆☆☆

عبدالروؤف عبدالرحیم مرحوم

☆ مکمل نام : شیخ عبدالروؤف
☆ ولدیت : عبدالرحیم
☆ تخلص : روؤفؔ
☆ پیدائش : ۱۹۴۵ء
☆ تعلیمی لیاقت : ہشتم

●

کوئی نا آشنا دنیا سے جب بھی آشنا ہوگا
سمجھ لے گا نتیجہ بھی برائی کا برا ہوگا

نکل کر شہر سے صحرا کی جانب دوڑتا ہوگا
کوئی دیوانہ رستے میں تجھے بھی دیکھتا ہوگا

انھیں فرصت نہیں حالات پر کچھ خود بھی فرمائیں
مگر میں سوچتا ہوں پیار کا انجام کیا ہوگا

حقیقت جلد ہی سارے زمانے پر عیاں ہوگی
اندھیرے ڈوب جائیں گے اجالا پھر صبح ہوگا

ہمیں تو ناخدا نے چھوڑ ڈالا بیچ دریا میں
تلاطم خیز موجوں میں ہمیں اب تیرنا ہوگا

روؤفؔ آیا تھا تنہا ہی نکل کر گاؤں سے اپنے
وطن کے واسطے ہنس کر لہو اپنا دیا ہوگا

☆☆☆

زرتاجؔ ہاشمی مرحوم

مکمل نام : ڈاکٹر سید قدیر ہاشمی
قلمی نام : زرتاج ہاشمی سحر
تاریخ پیدائش : یکم مئی ۱۹۴۷ء
تعلیم : B.Sc. M.A. Ph.D
ایوارڈ : ETV اُردو کی جانب سے منعقدہ شعری مقابلہ ''کل اور آئیں گے'' میں ریاستی سطح پر پہلا انعام حاصل کیا تھا۔

●

اُڑانیں ہوں اونچی تو پر کاٹتے ہیں
یہ اپنے ہی اپنوں کے سر کاٹتے ہیں

بڑے پیچ و خم ہیں تری رہ گزر میں
دِوانے مگر یہ سفر کاٹتے ہیں

پرندوں کو سرحد سے کیا واسطہ ہے
سفر یہ کدھر سے کدھر کاٹتے ہیں

وہی شاخ جس پر کہ بیٹھے ہیں خود
نہیں کاٹنا تھا مگر کاٹتے ہیں

چلے آیئے پھر خدا کے لیے اب
کہ رہ رہ کے دیوارِ و در کاٹتے ہیں

وہیں آگئے ہم بھی زرتاجؔ آخر
جہاں لوگ دستِ ہنر کاٹتے ہیں

☆☆☆

☆☆☆☆☆

شاعری (غزلیات)

بشارت علی خان اختر
(حیدرآباد)
موبائل :
8919499980

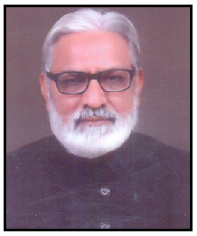

رنگ و بو کے شوق میں جانے اب کدھر گئی
آج پھر وہی ہوا شام گھر اتر گئی۔
چھپ گیا ہے چاند بھی گم ہوئے ستارے بھی
انتظار شوق میں آدھی شب گزر گئی
یاد کے حسیں کنول کھل رہے تھے جھیل میں
پھر نہانے چاندنی جھیل میں اتر گئی
ایک بار ناو بھی ٹوٹ سی گئی مگر
عزم دیکھ کر مرا نہ جانب بھنور گئی
سر جھکائے وہ نظر اٹھ رہی تھی بارہا
بس نگاہ کیا لڑی چار سو خبر گئی
اک دیا منڈیر پر جل رہا تھا شام سے
سر پھری ہوا بھی پھر دیکھ کر ادھر گئی
آرزو میں خوشبو کی اخترؔ آئی تتلی پر
دیکھ پھول کاغذی دور ہی ٹھہر گئی

☆☆☆

علیم صبا نویدی
(چنئی)
موبائل :
9176137462

یقیناً حشر ساماں زندگی تھی
کہاں جنت بداماں زندگی تھی
بظاہر دل تھا خوشیوں کا خزانہ
بہت مجروح نالاں زندگی تھی
بہت لوٹا ہے مجھ کو آرزو نے
ابھی کچھ دن کی مہماں زندگی تھی
امیدوں کا لہو جس نے کیا تھا
اسی پر آج قرباں زندگی تھی
کسی نے آج تک سمجھا نہیں ہے
مبارک نور افشاں زندگی تھی
جہاں دیدہ سبھی پر تھی مہرباں
کہاں اپنی غزل خواں زندگی تھی
نئے فطری تقاضے تھے نویدی
جو سوچوں میں چراغاں زندگی تھی

کلیم کسک (پربھنی)
موبائل : 9890959642

کسی کو بے سبب رسوا ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
سنو تم نے کبھی ایسا ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
کیا قربان جس کے خواب ...... پر اپنی ...... حقیقت کو
اُسی نے مجھ کو اِک قصہ ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
چٹانوں سے بھی ٹکرا کر ...... نہ ٹوٹا تھا ...... کبھی یہ دل
محبت نے اِسے شیشہ ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
خزانے بھر دیئے تھے جس کے ......ہم نے روبرو...... اُس کے
بڑھا کر ہاتھ کو کاسہ ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
کبھی کوئی خطا مجھ سے ہوئی تھی ...... پر مرے ...... ہمدم
وہ قطرہ تھی اُسے دریا ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
کروڑوں میں خریدوں اُس کو......اک پیسے میں......بک جاؤں
مجھے ایسا کوئی سودا ...... نہیں کرنا تھا ...... کر ڈالا
حقیقی کو بھلا کر کھو گیا ...... تھا میں ...... مجازی میں
کسکؔ توبہ مری توبہ ...... نہیں کرنا تھا ...... کرڈالا

رباعی
(معافی نامہ)

شاہ حسین نہری(اورنگ آباد)

احباب سے رشتے داروں سے اپنے
استدعا ہے میری سبھی لوگوں سے
ہوتے آئے ہیں دن اب میرے پورے
کردیں وہ معاف مجھ کو سچے دل سے

رضاؔ جالنوی(اورنگ آباد) موبائل : 8454974740

جب کبھی ترکِ تعلق پہ نظر جاتی ہے
لاکھ چاہا نہ اٹھے پھر بھی اُدھر جاتی ہے
دن گزر جاتا ہے دن کا نہیں رونا لیکن
شبِ تنہائی مرے پاس ٹہر جاتی ہے
صبحِ نو کتنے مسائل کو لئے آئے گی
رات ایسے ہی خیالوں میں گزر جاتی ہے
صبر کی خو بھی نہیں ضبط کا یارا بھی نہیں
کیسی بستی ہے جو لمحوں میں بکھر جاتی ہے
چیخ کا رنگ نہ خوشبو نہ بدن ہے کوئی
یہ تو ٹکرا کے سماعت سے بکھر جاتی ہے
پیچ تقدیر کا ہے یہ نہیں زلفِ جاناں
زلفِ جاناں تو الجھ کر بھی سنور جاتی ہے
اپنے چہرے پہ عبارت کو ابھرنے مت دو
دور تک دل کی تباہی کی خبر جاتی ہے
ہم نے کشتی تو سمندر میں اتاری ہے رضاؔ
کیا پتہ موجِ بلا لے کے کدھر جاتی ہے

☆☆☆

شاعری (غزلیات/ہائیکو/ماہیے/قطعات)

اطہر کلیم
(ناندیڑ)
موبائل : 9657655569

ساری محنت جو عمر بھر کی ہے
بس یہ تیاری اُس سفر کی ہے
کیا اسے زندگی ہی کہتے ہیں
جو ترے نام پر بسر کی ہے
آنکھ چندھیا رہی ہے کیوں میری
ایک چادر تو رخ سے سرکی ہے
مشعلیں کیوں نہیں جلاتی یہ
منتظر قوم کیا سحر کی ہے
وہ بھی خود کو سمجھ رہا خورشید
زندگی جس کی رات بھر کی ہے
دل کو تسکیں ہے تیرے آنے سے
ایسی افواہ مشتہر کی ہے
مار ڈالا ہے مرکزی کردار
اور کہانی بھی مختصر کی ہے
تیرگی حد سے بڑھ گئی اطہر
اب ضرورت نئی سحر کی ہے

کے انیس اظہر (ویلور)
موبائل : 9003858940

بخت خفتہ کو جگائیں کیسے
زندگی اپنی بنائیں کیسے

کھو چکا جو اسے پائیں کیسے
ہم گئے وقت کو لائیں کیسے

بے رخی ان کی کھٹکتی ہے بہت
ان کو یہ بات بتائیں کیسے

بے وفا یاروں نے یہ بتلایا
رخ بدلتی ہے ہوائیں کیسے

جو بچھڑ جائے ' ہم اس راہی کو
راہ میں چھوڑ کے آئیں کیسے

جس سے وابستہ ہے بچپن اپنا
دل سے وہ نقش مٹائیں کیسے

آج کے دور میں ہم اے اظہر
خود کو فتنوں سے بچائیں کیسے

☆☆☆

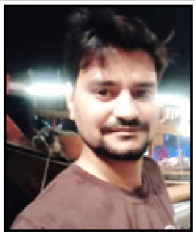

ظفر صدیقی
(لکھنؤ)
موبائل : 9839666203

وصل کی کر گیا اُدھاری پھر
ہجر میں رات ہے گزاری پھر
عشق تم کو نہیں اگر ہم سے
پڑھتے کیوں ہو غزل ہماری پھر
بات کی تھی تیری سہیلی سے
کیوں بڑھی تجھ میں بے قراری پھر
اک نظر دیکھ کیا لیا اُس نے
مجھ پہ چھائی عجب خماری پھر
ہو کے وہ خوش گیا مرے در سے
خوب دے کر دعا بھکاری پھر
کر رہیں ہیں دعائیں اہلِ چمن
آ گیا ہے ظفر شکاری پھر

☆☆☆

فہیم خاتون مسرت (ناندیڑ)
موبائل : 77749055558

لو خبر ہوگئی زمانے کو
لوگ آئے ہیں دل دکھانے کو
تیری نفرت نے پل میں توڑا ہے
عمر لگتی ہے گھر بسانے کو
بھیگی آنکھوں کے خواب کی گرہیں
کھل گئیں دل میرا جلانے کو
تجھ کو جب سے بھلانا چاہا ہے
لب ترستے ہیں مسکرانے کو
زخم لمحوں نے جو دیئے مسرت
دل کو برسوں لگے بھرانے کو

ماہیے

طٰہٰ صدیقی (پربھنی)
موبائل : 9420889011

یہ بات پرانی ہے
ہیر تھی رانجھا تھا
مشہور کہانی ہے

☆

ٹھہرا سا یہ پانی ہے
جیسے کوئی دلدل
بے فیض جوانی ہے

ہائیکو

فراغ روہوی

گھر کیا، دفتر میں
ہم تو ڈوبے رہتے ہیں
سوچ سمندر میں

☆

خواب تو بنتے ہیں
لیکن آنکھیں کھلتے ہی
کرچیں چنتے ہیں

☆

تعبیریں نایاب
پھر بھی بنتے رہتے ہیں
نئے نئے ہم خواب

☆

قطعات

رضا جالنوی (اورنگ آباد)
موبائل : 8454974740

یوں نظمِ گلستان کو شاطر بگاڑ مت
امن و اماں کے پیڑ کو جڑ سے اکھاڑ مت
خوشبو گلوں سے اڑ گئی کلیاں بھی زرد ہیں
یوں تازگی نہ چھین چمن کو اجاڑ مت

نہ روشن دماغی نہ بیداریاں ہیں
وضع داریاں نہ طرحداریاں ہیں
چڑھا بیٹھے چہرے پہ چہرے ہزاروں
اداکاریاں ہی اداکاریاں ہیں

شاعری (رباعیات،قطعات)

سید طاہر حسین طاہرؔ
(ناندیڑ)
موبائل : 8087570387

فطرت میں کبھی جور و جفا مت رکھنا
دشمن کو بھی سینے سے جدا مت رکھنا
ہم لوگ ہیں مومن یہ کبھی مت بھولو
عیار و منافق سی ادا مت رکھنا

☆

آہیں نہ بھرو غم نہ کرو اے طاہرؔ
مالک سے ڈرو شاد رہو اے طاہرؔ
مومن ہو صداقت سے نہ منہ کو موڑو
آئینہ بنو صاف کہو اے طاہرؔ

☆

ذیشان دکھائی نہیں دیتا کوئی
لقمان دکھائی نہیں دیتا کوئی
ملتے ہیں بہت آدمی طاہرؔ لیکن
انسان دکھائی نہیں دیتا کوئی

☆

غیروں کی حمایت نہیں ہوگی ہم سے
اپنوں سے بغاوت نہیں ہوگی ہم سے
ہر حال میں حق بات کہیں گے ہم لوگ
حق سے یوں عداوت نہیں ہوگی ہم سے

☆

ہر روز یہ دشوار ہوئی جاتی ہے
کانٹوں کا بنا ہار ہوئی جاتی ہے
ہر روز نئے اِس کے تقاضے طاہرؔ
یہ زیست تو اک بار ہوئی جاتی ہے

☆

دل ہو کے بھی دلدار نہیں ہے کوئی
اب مونس و غمخوار نہیں ہے کوئی
مفلس کا کہیں تیرے سوا اے مولیٰ
دنیا میں مددگار نہیں ہے کوئی

☆

نفرت کے کبھی پاس نہ سائے رکھنا
آئینہ سدا دل کو بنائے رکھنا
اخلاص ، وفا ، پیار ، شرافت ، چاہت
دولت یہ بزرگوں کی بچائے رکھنا

☆

شعلوں کو عداوت کی ہوا مت دینا
الفت کے گلستاں کو جلا مت دینا
بن جائے نہ افسانہ کہیں اے طاہرؔ
چھوٹی سی کوئی بات بڑھا مت دینا

☆

صدموں میں بھی ہنس ہنس کے جیا کرتے ہیں
حالات سے کمزور ڈرا کرتے ہیں
طوفان سے ہم تو نہیں ڈرنے والے
ہم لوگ تو طوفاں میں پلا کرتے ہیں

☆

صحرا کو بھی گلزار بنانے والے
مغموم ہیں سب آج ہنسانے والے
کس سمت گئے کچھ تو بتاؤ طاہرؔ
دل ، جان صداقت پہ لٹانے والے

☆

میں سب سے الگ سب سے جدا رکھوں گا
زلفوں کو سدا تیری سجا رکھوں گا
اے جانِ غزل جانِ تمنا میری
میں تجھ کو کلیجے سے لگا رکھوں گا

☆

دن رات کی غیبت ارے توبہ توبہ
کب بدلے گی عادت ارے توبہ توبہ
ابلیس بھی حیران ہوا جاتا ہے
مسجد میں سیاست ارے توبہ توبہ

☆

ایک نور اگلتی ہوئی تیری یادیں
جگنو سی چمکتی ہوئی تیری یادیں
گلزار بنا دیتی ہے ذہن و دل کو
خوشبو سی مہکتی ہوئی تیری یادیں

☆☆☆

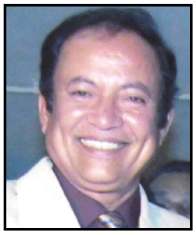

قطعات

فیروز رشیدؔ (پونہ)
موبائل : 9890581254

قوم عرصے سے ہے یہ خوابیدہ
خوابِ غفلت سے اب جگاؤ اِسے
گل کی بلبل کی شاعری کب تک
نغمہ بیداری کا سناؤ اِسے

☆

ٹھوکریں ہر طرف سے ملتی ہیں
پھر بھی لب پر کسی کے آہ نہیں
یہ بدلتی ہے ذہن قوموں کا
شاعری صرف واہ واہ نہیں

☆

بدلنا ہوگا تجھے اپنی سوچ کا انداز
اُمید فیض نہیں ہے تو کھوجتا کیا ہے
عروجِ قوم کے امکاں پہ غور کر ناداں
زوالِ قوم کے اسباب سوچتا کیا ہے

☆☆☆

شاعری (ایک نظم، ایک غزل)

روشنی کا مسافر

(ارشد صدیقی پر نظم)

غلام ثاقب (بیڑ)
موبائل : 9226368493

منزلِ روشن کی وہ تعبیر ہے
بولتی اخلاق کی تصویر ہے
حوصلہ ان کا ہمیشہ ہے بلند
توڑی ہر اک جھوٹ کی زنجیر ہے

بے کسوں کا والی بننا ہے کمال
ارشدؔ صدیق ہیں زندہ مثال
ہے زباں اردو اور اس پہ سادگی
سادگی میں خوب ہے ان کا جمال

رونقیں اردو کی ہیں روشن وہاں
ارشدؔ صدیق شامل ہو جہاں
عبدالقادر غوثیہ رونق جمال
یا ظفر میم سب ہے منظورِ جہاں

جاوید و صادق کا ممبئی میں ہے گھر
اور علیم سجاد مختار مجیب سر
یوسف صابرؔ اور نذیرِ فتح پور
رشتۂ سلطان اختر خوب تر

ان کی یادوں میں ہے ماضی کی جھلک
ان کی آنکھوں میں ہے اردو کی چمک
ان کی باتوں میں ہے قدر و منزلت
ان کے لہجے میں ہے آہو سی لہک

اہلِ اردو بیڑ کے، روشن ادیب
دوست جن کے ہوں وہ ہے پھر خوش نصیب
اور ندیم وثاقب و سلطان بھی
ہے قریب ان کے ہیں اور ان کے حبیب

دوست، چائے اور اس اردو کے بن
جی نہ پائیں گے وہ اس خوشبو کے بن
ہیں رفیق ماجد و رزاق اور سلیم
شخص یہ سب کا بنا جادو کے بن

جھوٹ سے دھوکے سے ہے نفرت سدا
رہتے ہیں یہ سود سے بالکل جدا
رشتے داروں سے محبت کا سلوک
آج بھی ارشد نے رکھا ہے روا

ماں بہن بیٹی کی عظمت کا نشاں
باپ اور بھائی کا یہ دُرّ نہاں
ہے جمیلہ بانو گھر کی بیٹیاں
رخشاں و افشاں ہے ارشدؔ کا جہاں

مشکلوں میں ہو پھنسا کوئی ادیب
چاہے اپنا یا پرایا ہو غریب
یہ خموشی سے کریں سب کی مدد
بیوہ یا نادار ہو جو بھی قریب

شاعری افسانچے کی ہر کتاب
ان کے فکرو ذہن کا زرّیں گلاب
خود مصنف ہیں کتابوں کے ادیب
خدمتِ اردو میں ہیں وہ لاجواب

اچھائیاں دنیا میں اب معدوم ہے
نیک عمل اس شخص کو معلوم ہے
کارواں کا میر ہے اردو کے وہ
اور غمِ انساں سے وہ مغموم ہے

قبر کا اور حشر کا ہر دم ہے پاس
عشق سے لبریز دل اللہ سے آس
علم وحکمت سے ہے پر ان کا ذہن
رشتہ ان کا اپنے مولیٰ سے ہے خاص

ان کی ہر خدمت کو ہے ثاقبؔ سلام
ان کا دیں دنیا میں ہو اونچا مقام
وہ رہیں خوشحال اور خوش زندگی
اللہ ان کے گھر کرے رحمت دوام

☆☆☆

غـــــــزل

علیم صبا نویدی (چنئی)
موبائل : 9176137462

فکریاتی عمل ہے حصے میں
خوبصورت محل ہے حصے میں
ناز ہے جس کو اپنے بھارت پر
آج وہ گنگا جل ہے حصے میں
آپ کیچڑ کے رہنے والے ہیں
اور کیچڑ کنول ہے حصے میں
موت آئے گی ہے خبر کس کو
زندگی آج کل ہے حصے میں

☆☆☆

شاعری (نظمیں)

چاند پہ اُترا ہندوستان

ارشد مینا نگری (مالیگاؤں۔ناسک)
موبائل : 9823145386

اتنی اونچی بھرا اڑان
بن کے رہا دنیا کی شان
ارشد ہم خوش قسمت ہیں
چاند پہ اترا ہندوستان

ہنستا چہرا چہرا ہے
لمحہ خوب سنہرا ہے
سائنس دانوں کے سر پر
چاند کا روشن سہرا ہے

صدیوں بعد یہ پل آیا
کاوش کا رخ جھلکایا
چمکا مقدر بھارت کا
اونچا ہوا سر بھارت کا
چاند پہ جانے والوں میں
چوتھا نمبر بھارت کا

کسی طرح معذور نہیں
ذرا بھی ہم مجبور نہیں
سچ ہے ارشدؔ ہم سے اب
چندا ماما دور نہیں

محنت کا پھل پائیں گے
دنیا کو چونکائیں گے
دیکھنا یوں ہی ہم ارشدؔ
چاند کے آگے جائیں گے

☆☆☆

چاند کی دھرتی پر ارشدؔ
آج ترنگا لہرایا

یارب روشن پیار بھی دے
سم نفرت کا مار بھی دے
چاند سہانا دیا ہمیں
چاند سا ہر کردار بھی دے

پل مسرور مبارک ہو
حل مخمور مبارک ہو
ہر ظلمت مٹ جائے گی
چاند کا نور مبارک ہو

☆☆☆

بچہ اور اُردو

(ادب اطفال)

علیم طاہر (ممبئی)
موبائل : 9623327923

تو چاہت سکھاتی ہے چاہوں گا اردو
ترے ساتھ رشتہ نبھاؤں گا اردو
دیوانہ ہوں تجھ کو ہی سوچوں گا اردو
لکھوں گا پڑھوں گا میں بولوں گا اردو.....

بزرگوں کا ماضی تجھی سے ملے گا
مرا دل ہے غنچہ، تجھی سے کھلے گا
جو دل زخمی ہوگا تجھی سے سلے گا
چلوں گا ترے ساتھ ٹھہروں گا اردو
لکھوں گا پڑھوں گا میں بولوں گا اردو.....

زمانے میں یوں تو کئی ہیں زبانیں
تجھی پر مگر سب لٹاتے ہیں جانیں
سبھی تجھ کو بولے سبھی تجھ کو مانیں
ترانوں سے تیرے میں بہلوں گا اردو
لکھوں گا پڑھوں گا میں بولوں گا اردو.....

زباں مادری میری تو ہی زباں ہے
زباں تیرے جیسی کوئی بھی کہاں ہے
تو ہی میرا دل ہے تو میرا جہاں ہے
لگا کر گلے تجھ کو چوموں گا اردو
لکھوں گا پڑھوں گا میں بولوں گا اردو.....

☆☆☆

ماں

شاکر خان شاکرؔ پرتوری
موبائل : 8484949384

شفقت کا کبھی تیری ازالہ ہو نہیں سکتا
کوئی تجھ سی محبت کرنے والا ہو نہیں سکتا

چراغاں کو بکو کرلوں جلا کر دل جگر پھر بھی
بنا تیرے کبھی گھر میں اجالا ہو نہیں سکتا

خدا کے اور محمدؐ کے سوا جتنے بھی ہیں رشتے
میری نظروں میں کوئی تجھ سے اعلیٰ ہو نہیں سکتا

ذرا سی چوٹ پر میری تڑپ جانا سہم جانا
کسی کا تجھ سے یوں عالم نرالا ہو نہیں سکتا

اگر تم جاننا چاہو محبت کی حقیقت کو
سوائے ماں کے کوئی بھی حوالہ ہو نہیں سکتا

سلام عید اب کس کو کروں گا میں عقیدت سے
کوئی تجھ سا دعائیں دینے والا ہو نہیں سکتا

تسلی جتنی چاہے دے زمانہ مجھ کو اب شاکرؔ
دل بے چین کا ہرگز سنبھالا ہو نہیں سکتا

☆☆☆

شاعری (غزلیں، ماہیے، رباعیات)

غزل

یومِ اقبالؔ

مصرع طرح

(یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے)

ڈاکٹر مختار علی نفیس (جھنجھنو۔راجستھان)

موبائل : 9509180123

نہ جانِ جسم کی خاطر نہ جسم جاں کے لئے
مکاں کی قید لگائی ہے لامکاں کے لئے

میں عندلیب ہوں اک گلشنِ خموشی کا
ترس رہا ہوں زمانے سے ہم زباں کے لیے

یقین محکم و عظم صمیم و خلق عظیم
''یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے''

ستم ظریفی ذرا دیکھو وقت کی کہ ہمیں
امان دے کے ترستے ہیں خوداماں کے لیے

سبب ہے کچھ تو یہودی کی بالادستی کا
یہ قوم رکھی ہے مسلم کے امتحاں کے لئے

تقاضا وقت کا مختارؔ بس یہی ہے اب
صفیں درست ہوں اقبال کی اذاں کے لئے

غزل

رئیس احمد عاجز پرتوری

موبائل : 8793883550

کسی دن بند ہوگی یہ کتاب آہستہ آہستہ
بنے گا خاک تیرا پھر شباب آہستہ آہستہ

فقط جھوٹے یہ وعدے ہیں محبت کرنے والوں کے
بھلا دیں گے تمہیں بھی سب جناب آہستہ آہستہ

بڑی تھی دھوم جن کی ہر جگہ پر پارسائی کی
ہٹے ان کے بھی چہروں سے نقاب آہستہ آہستہ

نہ تھا ہم کو کبھی کوئی بھی ایسا شوق لیکن اب
ہمیں بھی چڑھنے لگتی ہے شراب آہستہ آہستہ

حسیں کتنا لگے ہے چاند تجھ سے بھی صنم میرا
جو سرکا اس کے چہرے سے حجاب آہستہ آہستہ

یہ حق ماں باپ کا ہے جب بھی عاجز ہو مخاطب تو
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

☆☆☆

ماہیے

ڈاکٹر یوسف صابرؔ (اورنگ آباد)

موبائل : 9326772575

بدنام نہیں کرتے
عشق میں عزت کو
نیلام نہیں کرتے

☆

ہے آس ابھی زندہ
آب نہیں تو کیا
ہے پیاس ابھی زندہ

☆

ہر حال میں جینا ہے
زہر جدائی کا
ہے پیار تو پینا ہے

☆☆☆

غزل

مظہر رحمان (گجرات)

موبائل : 9328926691

اگرچہ غازہ میں دیکھا قتال ہوتے ہوئے
یہودیوں کو بھی دیکھا حلال ہوتے ہوئے

امیرِ شہر ہے شامل پناہ گزینوں میں
جو بھیک مانگ رہے ہیں خوشحال ہوتے ہوئے

حواس کھو دیئے ہیں شہرِ یار تھے کل تک
کسی کی یاد میں غم سے نڈھال ہوتے ہوئے

کسی کے حالِ تباہ سے تو لیجئے عبرت
فریب کھا ہی گئے بے مثال ہوتے ہوئے

رباعیات

کے انیس اظہر (ویلور' تامل ناڈو)

موبائل : 8270225725

ہر بندے کو خدا سے ڈرنا ہے ضرور
جو کام ہے نیکی کا وہ کرنا ہے ضرور
ہر حال میں انجام رہے پیش نگاہ
سو سال بھی جی لے کوئی مرنا ہے ضرور

کب وقت قضا آئے کسے کیا معلوم
کب روح نکل جائے کسے کیا معلوم
جلد اپنے ہر اک جرم سے توبہ کرلو
کس حال میں موت آئے کسے کیا معلوم

افسانوں ادب (افسانچے مع مختصر تعارف)

مختصر تعارف _ ندیم مرزا

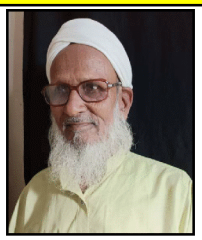

(بقلم : غلام ثاقب۔9226968493)

نام : مرزا عظمت اللہ بیگ

والد : مرزا امیر بیگ

قلمی نام : ندیم مرزا

والدہ : سعادت بیگم

تاریخ پیدائش :1950ء

فرزندان : وسیم مرزا ، فہیم مرزا ، شمیم مرزا

دختران : عطوفہ اختر ، فجستہ اختر

وطن : فتح آباد (تعلقہ دھارور ضلع بیڑ)

خاندان : مغلیہ خاندان سے راست تعلق

خلافت : خلیفہ حضرت پیر محوی شاہ رحمتہ اللہ علیہ

کتب: جمال ندیم، کمال ندیم (تنقید، تبصرے، تجزیئے و ادبی مضامین کا مجموعہ)، تذکرہ حضرت شہنشاہ ولیؒ، خیال ندیم (مجموعہ کلام)، تجلی (خاکچوں کا مجموعہ)، تعلیمات محوی۔

پیشہ : موظف ٹرافک کنٹرولر۔مشرب : صوفی

امتیاز : انشاء پردازی اور خوبصورت لب و لہجے و فلسفیانہ انداز گفتگو و تحریری شگفتگی بے مثال ہے۔

موجد : خاکچہ نگاری

اصناف سخن : غزل، ثلاثی، رباعی، قطعات، افسانچہ نگاری اور خاکچہ نگاری

خدمات: ہفت روزہ حالات ہند بیڑ، روزنامہ آج بیڑ ایڈیشن میں کتابت۔ روزنامہ تعمیر کے سابق نائب مدیر۔ روزنامہ الہلال ترجمہ نگاری۔ نکھار ادب ڈائجسٹ (مئوناتھ بھنجن)، شمع ادب (سلطان پور)، تراش (کوٹہ راجستھان)، پرواز (لدھیانہ)، مسرت (پٹنہ)، ماہنامہ نور (رامپور)، پاسبان ادب خصوصی شمارہ (ممبئی)، کہکشاں (ممبئی)، بنجارہ (لکھنؤ)، اردو ٹائمز (ممبئی) ، انقلاب (ممبئی)، اخبار عالم (ممبئی) ، روزنامہ ہندوستان (ممبئی) ، منصف (حیدرآباد)، اردو ڈائجسٹ (اسپین)، روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز (اورنگ آباد) ، روزنامہ ایشیاء ایکسپریس (اورنگ آباد) و دیگر معروف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔ شمع، نئی دنیا، فلمی دنیا، ہفت روزہ بلٹز، دعوت، پیام مشرق، شاعر، تریاق، مشرقی آنچل، پاکیزہ آنچل جیسی درجنوں ادبی رسائل کے فروغ کے لئے برسہا برس انہوں نے ترسیل کی اور ان کی نمائندگی کی۔

پچاس سال سے زائد عرصے سے اردو زبان و ادب، اردو اخبارات اور اردو خطاطی کی ترویج میں زبردست کام کیا۔

اعزازات :

1) ایک شام ندیم مرزا کے نام منعقد

2) شولاپور میں ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی امریکہ کے ہاتھوں سپاس نامہ و اعزاز تفویض

3) بزم احباب اردو بیڑ کی جانب سے اعتراف خدمات ایوارڈ تفویض

4) خاکچہ نگاری ایجاد کرنے پر خصوصی سیمینار منعقد

5) کئی ادبی پروگراموں کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔

6) پونہ میں ڈاکٹر نذیر فتحپوری کے ہاتھوں خصوصی

اعزاز یہ دیا گیا اور اعتراف خدمات کیا گیا۔

7) بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن سولاپور کے ذریعے ندیم مرزا کی صدارت میں پروگرام منعقد اور خصوصی اعزاز یہ دیا گیا۔

8) عکس ادب اورنگ آباد کے سالانہ پروگرام میں خصوصی استقبال کیا گیا اور اعزاز سے نوازا گیا۔

9) عکس خیال زیر ترتیب

10) بزم شمع ادب، بزم آبگینہ، بزم احباب اردو ادب کی بنا سے لے کر پچاس برسوں تک اردو پروگرام منعقد کرنا، نئے لکھنے والوں کی تربیت کرنا، سیمینار منعقد کرنا، مشاعرے اور محفل افسانچہ و ادبی پروگرام منعقد کرنا، مضامین لکھنا جیسی اہم خدمات انجام دیں۔

11) نگر پالیکا جب بندیل پورہ میں قائم تھی اردو لائبریری کے قیام کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

12) ضلع مراٹھی سرکاری لائبریری میں اردو کتابیں رکھوائیں اور اردو اخبارات شروع کروائے۔

13) نور نگ پریس بیڑ میں برسوں تک اردو خطاطی اور اردو پریس کے تکنیکی معاون رہے۔

14) غوثیہ سلطانہ نوری (شکاگو، امریکہ) نے آپ کی شخصیت پر مضمون لکھا ہے۔ ☆

افسانچے

پیغام

ماحول کی آلودگی سے بھرپور غذا پا کر مچھر جوان ہو رہے تھے، ان کی جرأت و ہمت اتنی بڑھ گئی کہ مچھر دانی بھی

شمار میں نہیں تھی ..... !!

رات میں نے دروازے، کھڑکیاں بند کردیں، گڈ نائٹ لکوئیڈ مچھر مار لگادی اور سوگیا۔ اتنی اطمینان کی گہری نیند سویا کہ نہ کروٹ بدلنے کی حرکت وجنبش یادنہ خوابوں کی آہٹ۔

صبح نیند سے بیدار ہوا تو حیران رہ گیا۔ سوئچ بورڈ کا بٹن پوری رات آف تھا ..... !!

رات جاتے جاتے اندھیروں کو پیغام دے گئی.....!!!

احتیاط

اپنی سروس کے دوران وہ ہمیشہ محتاط رہا۔ ڈرائیونگ کے دوران کوئی حادثہ ہوا نہ کسی کو ہلکی سی خراش آئی۔ اس کی اس کارگذاری پر محکمے نے اسے ''25 سال محفوظ خدمات'' کا ایوارڈ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا :

اس کامیابی کا راز کیا ہے؟

اس نے جواب دیا :

اندر کی تمام لائٹس آف کرتا رہا ..... !!!

یکسانیت

عورت جو کچھ بھی کرتی ہے، بے خوف ہوکر کرتی ہے

بلی بھی آنکھ بند کرکے دودھ پیتی ہے

دونوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے

دونوں سمجھتے ہیں، انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے اللہ تعالیٰ بھی نہیں ..... !!

عادت

مجھے اٹھتا دیکھ میرے دوست نے کہا :

ارے بیٹھو، اتنی بھی جلدی کیا ہے؟

گھر کی یاد آرہی ہے۔

کون سے گھر کی؟ بیوی کو گذرے عرصہ ہوا، اولاد پرندوں کی طرح دوسرے درختوں پر اپنے آشیانے بنا چکی ..... کس گھر کو یاد کررہے ہو؟

''کیا کروں؟ گھر کو میری عادت نہیں، مجھے گھر کی عادت ہوگئی ہے۔''

رشتہ

بہت دنوں بعد دوست سے ملاقات ہوئی، میں نے پوچھا :

خیریت سے ہو بھائی، نظر ہی نہیں آتے، کہاں ہو؟

سب خیریت ہے، حیات نگر میں اپنا فلیٹ ہے، وہیں رہتا ہوں

اور والدین ..... ؟

''ان کے پاس چھوٹا بھائی رہتا ہے۔''

کہانی در کہانی

بڑھاپا آواز دیتا رہا

جوانی سوتی رہی

لڑکپن کھیلتا رہا

بچپنا مسکراتا رہا

پرسکون سطح سمندر پر کنکر گرتے رہے

لہر بہ لہر، دائرے بنتے بگڑتے رہے

ان کہی

سسکتی جوانی، تڑپتا بڑھاپا!

اس سے بڑھ کر بددعا اور کیا ہوگی.....!!!

ترقی

پہلے بڑے واقعی بڑے تھے

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ سلامتی کی دعائیں تھیں

''السلام علیکم''

جتنے بڑے بدن تھے سمٹتے جارہے ہیں، چھوٹوں کی آوازیں بلند ہوگئیں، بڑے سہم کر، دبک کر پڑے ہیں۔

ناصح

اب میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ، چار دیواری

ایک دروازہ، نیچے سنگی فرش

اور سر پہ ٹین کا سائبان رہ گیا تھا۔

بس میں اور میری تنہائی تھی!!

میں بھول گیا تھا، تنہا آیا تھا، تنہا جاؤنگا

کسی نے سچ کہا ہے

وقت سے بڑا ناصح کوئی نہیں!!!

ہوائی سفر

میں نے زندگی میں کبھی ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا، مگر میرا دعویٰ ہے کہ میں بھی ہوائی جہاز کا مستقل مسافر ہوں

جب رات آتی ہے، تکیہ پہ سر رکھ دیتا ہوں۔

میرا ہوائی سفر شروع ہوجاتا ہے۔

اردو

کون کہتا ہے اردو یتیم ہے، اردو زبان کو اپنی زبان کہنے والے، اردو کی روزی روٹی کھانے والے، یتیم اور محتاج ہیں، یقین نہیں تو دیکھ لو، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، موبائیل فون پر جب بھی کوئی میسیج ٹائپ کریں گے، رومن انگریزی میں کریں گے۔

یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

☆☆☆

☆☆☆☆☆

افسانوی ادب (افسانے)

کاش ایسا ہوتا

رمانہ تبسم (پٹنہ)
موبائل : 9973889970

مختار صاحب ابھی سو کر اٹھے ہی تھے کہ اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ انہوں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے اپنی بیٹی ایمن کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

''ایمن بیٹی! تم......اتنی صبح......سب خیر تو ہے، تنویر بابو کہاں ہیں۔''

ایک ساتھ انہوں نے کئی سوالات کر ڈالے۔

''وہ نہیں آئے ہیں ابّو......میں اکیلے آئی ہوں۔''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آواز سن کر اس کی امی اور بہن بھی وہاں آ گئے۔ انہیں دیکھ کر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ ماں کے گلے لگ کر بے اختیار رو پڑی۔ سبھی لوگ اسے اس طرح روتا ہوا دیکھ کر گھبرا گئے۔

مختار صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''ایمن بیٹی......کیا بات ہے......؟ اس طرح تم کیوں رو رہی ہو......؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔''

''ابو! تنویر کے گھر والوں نے ایک لاکھ نقد اور گاڑی کی مانگ کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ جب تک تمہارے والدین ہماری فرمائش پوری نہیں کریں گے، تم اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔'' بیٹی کی بات سن کر مختار صاحب پریشان ہو گئے اور اداس لہجہ میں بولے۔

''لیکن......انہوں نے گاڑی اور نقد کی مانگ نہیں کی تھی۔ صرف ایل سی ڈی، ڈبل ڈور فریج اور ڈائننگ ٹیبل کا مطالبہ کیا تھا اور میں ان لوگوں کی فرمائش سے کچھ زیادہ ہی دے چکا ہوں۔ شادی کے بعد پھر ان چیزوں کی فرمائش یہ تو سراسر ظلم ہے، میں نے جو کچھ بھی ان لوگوں کو دیا ہے، اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا ہے۔ میں تمہارے سسرال جاؤں گا ایمن بیٹی......تنویر بابو اور اس کے والدین کو سمجھاؤں گا۔''

ایمن وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنے ارمان سے اس کے والدین نے اس کی شادی کی تھی۔ چار بہنوں میں وہ سب سے بڑی تھی۔ اس کے والد ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھے اور ان کی تنخواہ بھی معمولی تھی، اس کے باوجود انہوں نے اپنی چاروں بیٹیوں کو اچھی تعلیم دلائی تھی۔ جب ایمن نے بی اے مکمل کر لیا تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ کئی جگہ سے اس کے رشتے آ رہے تھے، لیکن ہر جگہ جہیز کا مطالبہ تھا۔ اس کی عمر بھی ہونے لگی تھی۔ اس سے چھوٹی تین بہنیں اور تھیں اور وہ بھی شادی کے لائق ہو گئی تھیں۔ مختار صاحب نے فیصلہ کیا کہ کسی سے قرض لے کر لڑکے والوں کی فرمائش پوری کر دیں گے۔ آخر ان کی مراد بر آئی۔ چند دنوں کے بعد ایمن کو تنویر کا رشتہ آیا۔ وہ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا اور اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لوگ ایمن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ایک ہی نظر میں ایمن کو پسند کر لیا۔ جب جہیز کی بات آئی تو ان لوگوں نے کہا کہ آپ لوگ جو بھی دیں آپ کی مرضی، لیکن اس کے بعد ان لوگوں نے جہیز کی لمبی چوڑی فہرست ان کے سامنے رکھ دی۔ مختار صاحب نے مجبوراً یہ سب چیزیں دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب ایمن سرخ جوڑے میں رخصت ہو کر اپنے سسرال آ گئی۔ شادی کے کچھ دنوں تک سسرال والوں نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، لیکن اس کے بعد اس کے سسرال والوں نے ایک لاکھ نقد اور گاڑی کے لئے اس کے ساتھ مار پیٹ کرنا شروع کر دی اور اس کو والدین کے گھر بھیج دیا۔ اس کے ہاتھوں سے حنا کا رنگ ابھی ہلکا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے گھر آ گئی۔

ایمن کو گھر آئے کئی ماہ ہو گئے، اسے سسرال سے لینے کوئی نہیں آیا۔ اس کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ان کی یہ فرمائش پوری کرتے۔ ایمن نے ایک اسپتال میں نرس کی نوکری کر لی۔

ایک روز وہ ڈاکٹر شرما کے کیبن میں بیٹھی ان سے کچھ ضروری گفتگو کر رہی تھی کہ ایک عورت چلاتی ہوئی ڈاکٹر شرما کے کیبن میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحب ...... میری بیٹی کو بچا لیجئے ...... ڈاکٹر صاحب ...... اس کے سسرال والوں کو جہیز میں ایک لاکھ نقد اور گاڑی نہیں ملنے پر اس کے سسرال والوں نے اسے جلا ڈالا۔''

تبھی اس کی نظر ایمن پر پڑی۔ اسے نرس کے روپ میں دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''بہو تم ......!''

''معاف کیجئے گا میں آپ کی بہو نہیں ہوں، میں ایک نرس ہوں، آپ کی بہو اس روز مر گئی تھی جس روز آپ لوگوں نے اسے جہیز کی وجہ سے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ میرا آپ لوگوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''تمہارا غصہ واجب ہے...... ہم لوگ تمہارے گنہگار ہیں......ہم لوگوں نے جہیز کی وجہ سے تمہیں گھر سے نکالا تھا......لیکن......دیکھو اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ آج میری بیٹی کو بھی اس کے سسرال والوں نے جہیز کی وجہ سے جلا ڈالا۔ بیٹی اس وقت میں یہ بھول گئی تھی کہ اللہ نے مجھے بھی بیٹی دی ہے۔ مجھے معاف کر دو بہو، جب انسان کو ٹھوکر لگتی ہے تبھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔''

ایمن سوچنے لگی......کاش......اسی طرح ہر انسان کو اپنی بیٹی کا خیال آ جائے تو کوئی بھی لڑکی جہیز کی وجہ سے نہ تو جلائی جائے گی......اور......نہ اپنے والدین کے گھر بھیجی جائے گی۔'' کاش ایسا ہوتا''

☆☆☆

پتھر موم ہو گئے

فوزیہ نسرین (پربھنی)
موبائل : 9890995123

''بھابی، او بھابی! جلدی سے ناشتہ لانا، امتحان کے لئے دیر ہو جائے گی۔'' صبا نے غصہ سے کہا۔

''ہونہہ! گھر کا کام بھی نہیں ہوتا، نہ سروس نہ کوئی مصروفیت۔ امی، میری سہیلی صوفیہ کی بھابی تو لیکچرر ہوتے ہوئے بھی گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے، جب بھی دیکھو کام میں مصروف، ہر کسی کو بھابی ملے تو ایسی ہی ملے۔'' صبا نے کہا۔

بھابی نے خاموشی سے صبا کو ناشتہ دیا۔ صبا نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور بیگ لے کر کالج کی طرف چل پڑی۔

صبا کے جاتے ہی امی نے کہا: ''بہو! صبا میری اکلوتی بیٹی ہے اور تم اُس کا خیال رکھا کرو، وہ ذرا ضدی ہے۔''

''اچھا امی! خیال رکھوں گی۔'' نازیہ کمرے سے برتن لے کر نکل پڑی۔ اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ آنسو پونچھ کر پھر اپنے کام میں جٹ گئی۔

شادی کے بعد سے زندگی بس ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ صبح اٹھنا، گھر کی صفائی، ناشتہ تیار کرنا، برتن دھونا، کپڑے دھونا، سارا دن کام میں گذر جاتا اور ساس، نند کبھی جھوٹے منہ تعریف بھی نہ کرتیں۔

پرسوں ہی اُن کے رشتوں کی بہن جب آئی تو اُن کے سامنے بہو کی برائیاں شروع کر دیں۔ ایک ایک کام میں عیب نکالے جانے لگے۔ سچ بہن میں تو اِس رشتے کی قائل ہی نہیں تھی لیکن صبا کے والد نے کب کسی کی سنی۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ نازیہ پڑھی لکھی اچھی لڑکی ہے اور میں نے اپنے بیٹے عامر کے لئے اُسے پسند کر لیا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ صبا کی سہیلی صوفیہ مجھے پسند ہے۔ تب کہنے لگے: ایسی فیشن ایبل لڑکی نہیں چاہئے۔ اور پھر انھوں نے اپنی ضد پوری کر لی اور ہماری خواہش رہ گئی۔

نازیہ چائے کی ٹرے سامنے رکھ کر چل دی۔ آنسو بہانے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

راشد گھر کے معاملات میں دخل نہ دیتے تھے۔ صبح دس بجے آفس چلے جاتے، شام پانچ بجے گھر آتے، کھانا کھاتے اور کسی دوست کے ساتھ نکل جاتے۔ چھٹی کا دن کبھی گھر پر یا کبھی دوستوں کے ساتھ گذارتے تھے۔

''بہو مجھے چائے بنا کر دینا۔'' سسر کی آواز سن کر نازیہ چونکی۔ وہ جلدی جلدی کچن میں داخل ہوئی اور سسر کے لئے چائے بنا کر لے آئی اور پھر ڈھیر سارے کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔

کپڑے دھونے کے بعد آرام کے لئے کمرے کی طرف چلی۔ اِتنے میں اُسے اپنی امی اور بہن کی آواز سنائی دی۔ وہ فوری پلٹی۔

''امی آپ آیئے بیٹھئے۔'' وہ بہت خوش ہوئی اور کچن میں جا کر چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے بھی لے آئی۔ صبا کے کمرے میں جا کر اُسے بھی چائے اور پکوڑے دینے کے بعد امی کے آنے کی خوشخبری سنائی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُس نے اُن کے آنے کا کوئی تاثر نہیں لیا اور کتاب پڑھتی رہی۔ وہ لوگ چلے گئے۔ نازیہ شام کے کھانے کی تیاری کے لئے کچن میں چلی آئی۔ برابر والے کمرے سے آواز آ رہی تھی۔ اپنے لوگ آ گئے تو خوب خاطر مدارت ہوتی ہے۔ نہ کسی کی روک نہ ٹوک۔ ہائے ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارا بھی کیا زمانہ تھا۔ ساس کے کہے بغیر ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے تھے۔ ساس کا حکم سر آنکھوں پر تھا۔

نازیہ نے گھر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ لگایا تھا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد وہ باغ کی نگرانی کرتی تھی، آج بھی وہ کام سے بہت تھک گئی۔ سوچا چلو وہیں چلیں۔ سرخ گلاب کے پھول، چنبیلی، موگرا اور دوسرے قسم کے پھول تھے۔ پھول اُسے بہت پسند تھے۔ وہ پھول چننے لگی۔

''السلام علیکم بھابی'' راحیلہ نے سلام کیا، جو اُس کی پڑوسی تھی۔ نازیہ نے پلٹ کر دیکھا ''وعلیکم السلام'' اور دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ نازیہ، راحیلہ سے کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی۔

صبا کا رزلٹ آ گیا۔ اس سال بھی وہ فائنل میں فرسٹ کلاس آئی۔ خدا نے اُسے حُسن اور تعلیم کی دولت سے نوازا تھا۔ جس سے وہ بہت مغرور ہو گئی تھی۔

صبا نے امی سے کہا کہ ہماری سہیلیاں شام میں گھر آ رہی ہیں۔ نازیہ صبح ہی سے گھر کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے ڈرائنگ روم سجایا، کھانا بنایا، ہلکے نیلے کلر کی پھول دار ساڑی پہنچیں، ہلکا سا میک اپ کیا اور زیورات پہننے کے بعد آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور ڈرائنگ روم کی جانب چل پڑی۔

سب سہیلیاں آ گئی تھیں۔ صبا نے امی اور بھابی سے تعارف کرایا۔ سہیلیوں نے بھابی کی خوب تعریف کی اور اُن کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانے بڑے شوق سے کھائے۔

''اللہ، صبا تمہاری بھابی کتنی ملنسار اور اچھی ہے۔ میری بھابی تو اُن کے برعکس ہے۔ ہر کسی کو بھابی ملے تو ایسی ہی ملے۔'' صبا کی سہیلی جبین نے کہا۔

صبا چپ چاپ سنتی رہی۔ سب سہیلیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ کیا بھابی واقعی اچھی ہے؟ صبا سوچنے لگی۔ آج اُس کے دل میں بھی بھابی کے لئے محبت پیدا ہو گئی۔ یہ محبت دوسروں کی تعریف کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ بھابی کا سلوک، ہمدردی اور محبت تھی۔ آج بھابی نے اپنی پتھر دل نند کا دل جیت لیا تھا۔

☆☆☆

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

مضامین (تحقیق وتنقیدی)

ڈاکٹر عصمت جاوید کی حیات وادبی خدمات

سید اشفاق علی (ریسرچ اسکالر)
اورنگ آباد (مہاراشٹر)
موبائل : 9890014729

اردو ادب کے گرانقدر خزانے میں جن لوگوں نے نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اس کی نوک پلک کو بھی سنوارا ان میں ایک نام ڈاکٹر عصمت جاوید کا بھی ضرور شمار کیا جائے گا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید برصغیر ہی نہیں بلکہ اردو دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ سرزمین پونا جس کا قدیم نام 'محی آباد' ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کا دیا ہوا ہے اس قصبے میں ایک مقام جونا کوٹ ہے جہاں اردو زبان وادب کے عالمگیر شہرت کے حامل شخصیت ڈاکٹر عصمت جاوید نے منشی عبدالباقی کے گھر' سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۲/اگست ۱۹۲۲ء کو آنکھ کھولی۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے ابتدائی تعلیم محلّہ گنیش پیٹھ میں واقع میونسپل اسکول نمبر ۱۰ سے اور پھر اینگلو اردو ہائی اسکول پونا سے حاصل کی۔ اس کے بعد بمبئی کے انجمن اسلام ہائی اسکول میں داخلہ لیا جہاں ان کی ملاقات سید اسعد گیلانی سے ہوئی جو اردو زبان و ادب میں ڈاکٹر عصمت جاوید کی دلچسپی اور شوق کا باعث بنے جس کے بعد وہ مضامین لکھنے اور شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے جس کے نتیجہ میں ڈاکٹر عصمت جاوید کو اسکول میگزین کے حصہ اردو کے لیے ایڈیٹر بنادیا گیا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے میٹرک کا امتحان بمبئی یونیورسٹی سے ۱۹۴۱ء میں اول درجہ سے کامیاب کیا اور اردو و فارسی مضامین میں امتیازی نمبرات حاصل کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اسمٰعیل یوسف کالج میں فرسٹ ایئر سائنس میں داخلہ لیا اور وہیں سے انٹر سائنس کا امتحان ۱۹۴۳ء میں پاس کیا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید انجینئر بننے کی خواہش رکھتے تھے لیکن کسی وجہ سے وہ اپنی اس خواہش کو پورا نہیں کر سکے اور ۱۹۴۷ء میں بی اے آنرز درجہ اول میں کامیاب کیا اور عارضی ملازمتیں اختیار کر کے' دوران ملازمت ہی ایم اے، الفنسٹن کالج بمبئی سے ۱۹۵۴ء میں اول درجہ میں کامیاب کیا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک وہ بمبئی کے اسمٰعیل یوسف کالج میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو و فارسی اور مراٹھواڑہ یونیورسٹی (جو اب ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کہلاتی ہے) میں اردو کے پروفیسر انچارج رہے اور ریٹائر ہونے تک اسی یونیورسٹی میں اردو کے ریسرچ گائیڈ بھی رہے۔ کچھ عرصہ یعنی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان وہ شولاپور کے شولاپور سوشل اسوسی ایشن کالج برائے آرٹس اور کامرس کے پرنسپل بھی رہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کو شہر اورنگ آباد اس قدر پسند آیا کہ ان کی سب سے پہلی کتاب ''فکر پیا'' (۱۹۷۱ء) یہیں سے شائع ہوئی۔ انھوں نے اس شہر کو نہ صرف عارضی رہائش گاہ بنایا بلکہ مستقل رہائش کے لیے بھی پسند کیا اور ۲۲/اگست ۲۰۰۲ء کو اپنے پیچھے اردو ادب کا ایک خزانہ چھوڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

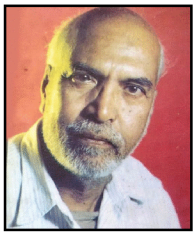

ڈاکٹر عصمت جاوید ایک تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے بطور شاعر، ادیب، نقاد اور مترجم اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں ہیں وہ تو لائق ستائش ہیں ہی لیکن اردو ادب میں وہ بطور ماہر لسانیات بہت نمایاں مقام پر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالرحمٰن محسن انصاری رقمطراز ہیں :

''ان کی تصنیفات وتالیفات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جس موضوع کو لیا اس کا حق ادا کردیا۔ اپنی شاعری اور خالص ادبی موضوعات تو درکنار انھوں نے لسانیات اور فن عروض پر بھی اپنی عالمانہ تحریر سے اردو میں اپنی شناخت قائم کی۔ یہاں تک کہ اردو الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور نتیجہ ان کی اپنی کتاب 'تلفظ نما اردو لغت' کی شکل میں موجود ہے۔ مہاراشٹر میں رہتے ہوئے مراٹھی زبان کا بھی حق ادا کیا اور اردو خواں حضرات کے لیے مراٹھی گرامر بنام 'مراٹھی آموز' سپرد قلم کیا۔ ان کی تحریروں کا کینوس وسیع ہے۔ ادبی مقالات، شاعری پر مضمون اور غزلوں کے مجموعے، اقبال کی اسرار خودی اور خیام کی رباعیات کے منظوم تراجم، لسانیات اور ادبی تنقید کے موضوع پر ایک کتاب 'فکر پیا' اور ترقی اردو بورڈ دہلی کی شائع کردہ 'نئی اردو قواعد۔ میں نے

ان کے ذخیرہ تصانیف میں سے چند کتب کا ذکر کیا ہے ورنہ فہرست بہت طویل ہے۔''

(پیش لفظ 'باقیات عصمت جاوید' ص ۶)

ڈاکٹر عصمت جاوید کی تحقیق اور مطالعے کا بنیادی موضوع 'لسانیات' ہے۔ تاریخی لسانیات، ساختی لسانیات اور توضیحی لسانیات کے تحت آپ کی لسانی خدمات کو پرکھا جاسکتا ہے۔ آپ کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو پر فارسی کے لسانی اثرات'' دراصل اردو میں مفرس عربی اور فارسی الفاظ کے لسانی مطالعے کی پہلی باقاعدہ عملی کوشش ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے ان تاریخی اور سماجی عوامل سے بھی بحث کی ہے جو اردو زبان کی نشوونما کے سلسلے میں کارفرما رہے ہیں اور اردو زبان کی اس تصریفی صلاحیت کا بھی لسانیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے جس کے سبب عربی، فارسی اور دیگر ہندی الاصل الفاظ کے ادخال اور تصرف سے اردو مالا مال ہوئی ہے اور تصرف کے عمل سے گزرتے ہوئے بہت جلد ایک مستقل زبان کی حیثیت سے آج اپنی شناخت قائم کرچکی ہے۔ عمل تصرف سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے صوتی تصرف، صرفی و نحوی تصرف اور معنوی تصرف کے مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ لہٰذا اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقاء اور اس کے لسانی مزاج کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر موصوف کا یہ مقالہ بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

اپنے متفرق لسانیاتی مضامین میں بھی آپ نے لسانیات سے متعلق مختلف مسائل اور نظریات سے بحث کی ہے۔ ''فکر پیما'' میں شامل آپ کے لسانیاتی مضامین لسانیات سے متعلق آپ کی ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خاص طور سے اردو زبان کے ذیلی صوتیے ڈاکٹر موصوف کا ایسا عمیق اور تجزیاتی مضمون ہے جس سے اردو زبان کے صوتیوں اور ذیلی صوتیوں سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے اور جن سے متعلق اردو کے مختلف علماء لسان میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسی کتاب میں انشاؔ اور محمد حسین آزادؔ کی لسانیاتی کاوشات کا مطالعہ بھی نئی تحقیق کی طرف مائل کرتا ہے۔

آپ کی لسانیاتی تحقیقات کے سلسلے میں ''نئی اردو قواعد'' بھی ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک اردو میں قواعد کا تصور بے حد جامد اور صرف ونحو تک محدود تھا۔ زبان کی مکتوبی اور تحریری شکل کو ہی بنیاد بنا کر قواعد کو دیکھا جاتا تھا لیکن جدید لسانیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان تحریری سے زیادہ کلامی یا تقریری ہوتی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اپنے کردار اور مزاج کو واضح کرتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے زبان کے اسی وصف کے پیش نظر اردو قواعد کو نئے سیاق وسباق اور منظر نامے میں دیکھا ہے۔ آپ کی یہ کاوش اردو قواعد میں یقیناً قابل لحاظ ہے۔

کسی شخصیت کا کسی مخصوص حیثیت میں مشہور ہو جانا بھی کبھی کبھی اس کے لیے وبال جان بن جاتا ہے کیونکہ اس شہرت کی وجہ سے جس میں وہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے' اس کے علاوہ لوگ اسے کسی دوسری خصوصیت کا حامل ماننے کے لیے یا تو ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے یا اس درجہ کا مقام نہیں دیتے۔ یہی بدقسمتی ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک ماہر لسانیات، ایک بہترین ناقد ہیں، نثر پر ان کی بڑی گرفت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بہترین شاعر بھی ہیں، اس بات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ بحیثیت شاعر ان کا اردو ادب میں جو مقام ہے وہ تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی شاعری پڑھ کر یہ احساس جاگزیں ہوا ہے کہ وہ ایک حساس شاعر ہیں۔ وہ نو بہ نو مضامین کو بڑی چابکدستی سے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ سیاست ہو یا معاملات زندگی، منافقت ہو یا دوغلا پن یا کوئی اور زندگی سے جڑے مسائل ہوں وہ ایک حساس شاعر کو کسی طور چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید کو اجتماعی حسیت کا احساس اور اسے بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی گرفت میں لینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ان کے بیان میں روانی کے ساتھ شیرینی بھی ہے۔ بین الاقوامی فکری پس منظر کے ساتھ معاشرت، سیاست اور تہذیبی روایات پر ان کی گہری نظر ہونے کے سبب ان کی شاعری میں سچا تخلیقی حسن دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی غزلیہ شاعری، لسانی و اسلوبیاتی گہرے نقوش سے عبارت ہے۔ ان کی غزل، نظم، قطعہ اور رباعی پر الفاظ غالب ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ایسے ہیں جس میں شاعر کا تعلّی کا احساس ہی نہیں ہے بلکہ اس تعلّی میں اس کا شعور، اس کا عہد اور اس کا وجود سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔

سیاح دور دور سے آتے ہیں دیکھنے
پتھریلے شہر میں وہ اکیلا درخت ہے

☆

وہ تو سورج ہے' جہاں جائے گا' دن نکلے گا
رات دیکھی ہو تو سمجھے کہ اندھیرا کیا ہے

☆

جو مجھ پر نثر کا ہوتا نہ قرض اے جاوید
میں شاعری میں بڑا نام کر گیا ہوتا

☆

آئندہ و گزشتہ کو مجھ میں کرو تلاش
پڑھتے ہیں جس کو روز وہ اخبار میں نہیں

☆

پت جھڑ کی رت میں، کاغذی پھولوں کے درمیاں
میں ہی تو ایک پھول بچا ہوں گلاب کا

رؤف خیر نے ڈاکٹر عصمت جاوید کی شاعری سے متعلق لکھا ہے :

''لسانیات کے خشک موضوعات میں الجھے رہنے کے باوجود عصمت جاوید کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ و سلامت رہا۔ یہی ہم زاد بعد میں روپ بدل بدل کر ان کی پہچان بھی بنتا گیا۔''

ڈاکٹر عصمت جاوید ایک بہترین مترجم بھی تھے۔ انھوں نے کئی فارسی اور دیگر زبانوں کے شاہکار کلام کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جس میں ''عکس لالۂ طور''، ''ارمغان حجاز''، ''بیاں اپنا اپنا'' وغیرہ شامل ہیں۔

آپ نے کئی تنقیدی مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں، کئی کتابوں میں آپ کے پیش لفظ اور مقدمے بھی موجود ہیں۔ آپ کی کل تصنیفات کی تعداد تقریباً ۲۴ کے قریب ہیں۔ ان کتابوں میں سے بارہ کتابیں اورنگ آباد سے شائع ہوئیں، چار کتابیں دہلی سے، دو کتابیں بمبئی سے، دو پونہ سے، دو الٰہ آباد سے، ایک لاہور (پاکستان) سے اور ایک مالیگاؤں سے۔ یہ تمام کتابیں اردو زبان و ادب کے خزانے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے جو مختلف موضوعات اور اصناف سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ ایک مختصر سا تعارفی مضمون ہے اس لیے طوالت کے خوف سے ان کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ علمی سرمایہ ہے جو ڈاکٹر صاحب کو اردو ادب میں ایک اونچا مقام مہیا کرتا ہے اور انھیں ایک پہچان عطا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر بطور خاص ہندوستان اور خصوصاً صوبہ مہاراشٹر اور اس میں بھی ضلع اورنگ آباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں ایک ایسے شخص کی معیت حاصل ہوئی ہے جس کا ڈنکا پوری اردو دنیا میں بجا اور اردو ادب کی تاریخ جس کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ یہ خصوصیت اس بات کے لیے اردو داں طبقے کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ڈاکٹر عصمت جاوید کی علمی و ادبی خدمات سے اردو کے طالب علموں کو روشناس کرائیں۔

☆☆☆

بقیہ : اردو ماہیا نگاری اور خواتین قلمکار

چھوٹے ہیں یہاں پتے
پیسہ بڑا جانا
کمزور ہیں سب رشتے
(شبہ طراز)

ہر فاختہ گھائل ہے
امن کے رستے میں
بارود جو حائل ہے
(سرور سلطانہ)

خواتین نے طنز و مزاح کو بھی ماہیوں کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے ؎

کیسی یہ ولایت ہے
کالوں کو جب دیکھو
گوروں سے شکایت ہے

☆

انگلینڈ کے کیا کہنے
گرمی میں میموں نے
کپڑے ہی نہیں پہنے
(ڈاکٹر رضیہ اسماعیل)

☆ **ماحصل** : خواتین نے ماہیے پر صرف تخلیقی سطح پر ہی کام نہیں کیا بلکہ ماہیے کی تاریخ میں تحقیقی و تنقیدی طور پر بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اس ضمن میں ''ماہیے کی ہئیت اور وزن'' از غزالہ طلعت، ''ماہیے کی بحث کا منظر نامہ'' از : شاہدہ ناز اور گلبن کا ماہیا نمبر از ثریا شہاب منظر عام پر آئے ہیں۔ منزہ اختر شاد کا ایک خط ماہنامہ صریر میں شائع ہوا جو ماہیے کی بحث میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ نصرت یاسمین نے ''اردو ماہیا اور ضمیر اظہر'' پر اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار بھی کیا ہے۔

صنف ماہیا نگاری کے میدان میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نظر آرہی ہیں۔ جس سے خواتین کے فن کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ماہیہ ایک دلکش شعری صنف ہے۔ یہ اردو میں بہت مقبول ہوئی ہے۔ ماہیے کے لئے مخصوص اوزان ہیں جن کا استعمال ماہیے کو مستند ماہیے بناتا ہے۔ خواتین ماہیہ نگاروں نے ان اوزان کا سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ ماہیہ نگاری کی تاریخ کو خواتین ماہیہ نگاروں اور اِس فن میں تحقیق و تنقید پر کام کرنے والی خواتین قلمکاروں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

اردو ماہیا نگاری اور خواتین قلمکار

ڈاکٹر صبیحہ خورشید (ناگپور)
شعبۂ اردو آرٹی ایم ناگپور یونیورسٹی
موبائل : 7387624921

☆خلاصہ (Abstract)

ماہیا ایک سہ مصرعی صنف شاعری اور ایک پنجابی لوک گیت ہے۔جس کا سر چشمہ پنجاب ہی ہے۔باوجود اس کے پنجاب میں ماہیے صرف گائے جاتے ہیں جب کہ اردو میں ہمیں ماہیے تحریری شکل میں ملتے ہیں اور ادب میں باقاعدہ ایک صنف کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ماہیا جس وقت اردو ادب میں اپنی شناخت مستحکم کرنے کی کوشش میں مشغول تھا اور ترقی کی منازل طئے کر رہا تھا، اس سفر میں مرد قلم کاروں کے ساتھ خواتین بھی شامل تھیں۔خواتین نے بھی اس صنف سخن کا خیر مقدم کیا اور مرد کے ہمراہ اس کی آبیاری میں جٹ گئیں۔اس بات کا ثبوت اس مضمون میں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔

☆تعارف (Introduction)

ماہیا اپنی لَے میں عورتوں سے قریب تر ہے کیونکہ یہ وہ پنجابی صنف سخن ہے جس میں زیادہ تر عورتوں کی زبان میں جذبات کا اظہار ملتا ہے۔اسے اگر ہم پنجابی ثقافت کے تناظر میں دیکھیں تو یہ مردوں سے زیادہ عورتوں کی صنف معلوم ہوتی ہے جس میں عورت کی آواز مرد کے مقابلے میں زیادہ ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس کا سبب بیان کرتے ہوئے حیدر قریشی فرماتے ہیں :

''اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شادی بیاہ اور دوسری گھریلو تقریبات میں رنگ جمانے کے لیے خواتین ماہیے گاتی ہیں۔اسی لیے پنجابی ماہیے میں عورت کی آواز زیادہ طاقت ور محسوس ہوتی ہے۔'' جب اردو نے اس پنجابی صنف سخن کو خوش آمدید کہا تو مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی لبیک کہا اور بڑھ چڑھ کر اپنے جوہر دکھائے۔''

☆اردو ماہیا میں خواتین قلمکاروں کا حصہ :

اردو میں اس صنف کو اپنانے والی پہلی خاتون سیدہ حنا تھیں لیکن انھوں نے شروع میں تین مساوی الوزن مصرعوں کے ماہیے کہے بعد میں ماہیے کی تحریک سے بھی انھوں نے سبق حاصل نہیں کیا اور مساوی الوزن مصرعوں کے ماہیے شائع کرواتی رہیں اور یوں اپنی انا کے سبب ماہیے کے جہان میں اپنا مقام کھو بیٹھیں۔

اردو کی ابتدائی ماہیا نگار خواتین میں غزالہ طلعت ، فرحت نواز اور منزہ اختر شاد کے نام آتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کو نہایت خوبصورت ماہیے دیئے۔

پتھروں میں بھی جھرنے ہیں
برتن اپنے ہمیں
اب ان ہی سے بھرنے ہیں
(غزالہ طلعت)

شادی کے جھمیلے میں
شعر و ادب چھوٹا
بس ایک ہی ریلے میں
(فرحت نواز)

گنجل پڑے دھاگوں میں
لکھنے والے نے
کیا لکھ دیا بھاگوں میں
(منزہ اختر شاد)

مذکورہ بالا خواتین کے بعد شاہدہ ناز، بسمہ طاہر اور صدف جعفری نے فن ماہیا نگاری کے میدان میں قدم رکھا جس میں بسمہ طاہر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔صدف جعفری تین مساوی الوزن مصرعوں کی زیادہ خوگر تھیں لہٰذا بار بار کی لغزش سے وہ بھی اپنا مقام قائم نہ رکھ سکیں تاہم اردو کی پہلی خاتون ماہیا نگار شاہدہ ناز ہیں۔جنھوں نے ماہیے کے فنی تقاضے نیز اس کی ہئیت ، وزن اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ثابت قدمی کے ساتھ بڑی تعداد میں مسلسل ماہیے کہے۔

شاہدہ ناز ،بسمہ طاہر اور صدف جعفری کے ماہیوں کے بارے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فرماتے ہیں۔

'' شاہدہ ناز کے ماہیوں میں نفسیات کی گہرائی اور گیرائی ملتی ہے انھوں نے اظہار کے سانچے کو نئی روشنی دی ہے اور جذبہ و احساس کو فکر کی ہمہ گیری بخشی ہے۔ان کے یہاں عرفانیات ، وجدانیات اور جمالیات کی سرشار کن تیز لے مچلتی نظر آتی ہے۔''

اس دل کو تسلی ہے
جس کی نگاہوں میں
کعبے کی تجلی ہے
(شاہدہ ناز)

شاہدہ ناز کے بعد ثریا شہاب ، سلطانہ مہر ، عذرا اصغر ، یاسمین سحر ، کوثر بلوچ ، یاسمین مبارک ، نازیہ رحمٰن ، اختر بانو ناز ، مطلوب بی بی ، نزہت سمن ، پرزرق صنم ، ترنم ریاض ، نسرین نقاش ، بشریٰ رحمٰن جیسی معتبر ہستیوں کے قدم سے اردو ماہیے کی تحریک کو بڑھاوا ملا۔حیدر قریشی رقم طراز ہیں :

''خواتین ماہیا نگاروں نے اردو ماہیے کہتے وقت ایک طرف خود کو ماہیے کی لوک روایت سے منسلک رکھا تو دوسری طرف اپنے عہد کے مسائل اور دکھوں کا بھی

سامنا کیا ہے۔ یوں خواتین ماہیا نگاروں کے ہاں عمومی طور پر اردو ماہیا اپنی روایت سے منقطع ہوئے بغیر ارتقائی سفر کر رہا ہے۔ اردو ماہیے کے اس ابتدائی دور میں ماہیا نگار خواتین کی گراں قدر تخلیقی خدمات کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔''

ماہیا دراصل عورت کی زبان میں جذبات کا اظہار ہے جس کے موضوعات برہا اور دکھ درد ہیں۔ ماہیا کی اس تعریف پر خواتین صدفی صد اترتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس میں عورت کے نازک جذبات و احساسات نہایت خوبصورتی کے ساتھ ماہیے کے پیکر میں ڈھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جیسے :

ہاں تم سے یہ کہنا تھا
شام ڈھلے جانم
تیرے دل میں رہنا تھا
(عفرا قریشی)

جھرنوں کی روانی ہے
جلد چلے آنا
اک بات سنانی ہے
(شبہ طراز)

مت مجھ کو ستایا کر
دل میں اگر کچھ ہو
تو کھل کے بتایا کر
(ریحانہ قمر)

خوشبو کی طرح مہکے
پیار کی رت آئی
بلبل سے کہو چہکے
(بشریٰ ارشد)

فرقت کے لگے گھاؤ
بیت چلے موسم
اب لوٹ کے آجاؤ
(انیلہ لطیف)

کل رات جو میں سوئی
سپنے میں وہ آیا
میں اٹھ کے بہت روئی
(عذرا اصغر)

چھالوں کو کہاں دیکھے
تم نے فقط میرے
قدموں کے نشاں دیکھے
(پربھا ماتھر)

رسم ورواج ہو یا شادی بیاہ کی تقریبات ان میں خواتین ہی کا کردار بڑھ چڑھ کر نظر آتا ہے لہٰذا خواتین کے یہاں اس قسم کے ماہیوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مرد کے مقابلے میں خواتین اپنے گھر خاندان اور دھرتی سے زیادہ جڑی ہوتی ہیں اور دین کی طرف بھی زیادہ راغب ہوتی ہیں لہٰذا یہاں بھی خواتین کسی سے کم نہیں۔خواتین نے اپنے ثقافتی اور دینی موضوعات کو بھی ماہیے میں کثرت سے برتا ہے۔جیسے ؎

سینے پہ چلی گولی
بابل کے گھر سے
بیٹی کی گئی ڈولی
(نسمیہ خاتون)

قرآن یہ کہتا ہے
مومن وہ جس کے
دل میں رب رہتا ہے
(فرحت نسیم ہاشمی)

بلبل کی نوا چہکے
گنبد خضرا میں
روضے کی ہوا مہکے
(زبیدہ حئی)

خواتین کے یہاں ماہیوں میں رشتے ناطوں کا ذکر اور محبت کا بیان بھی رس گھولتا ہے۔جیسے ؎

ممتا بھرا سینا ہے
دل میری امی کا
چاہت کا خزینہ ہے
(بسملہ طاہر)

صورت میرے بھائی کی
یاد دلاتی ہے
بابا کی جدائی کی
(غزالہ طلعت)

عشق و محبت'' ماہیا'' کا بنیادی موضوع ہے۔ اس موضوع پر خواتین کی خامہ فرسائی اس کے نازک جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔جیسے ؎

سوچا ہے یہ کر جائیں
عشق کے دریا میں
چپ چاپ اتر جائیں
(عرفانہ امر)

سیلاب کا پانی ہے
پیار جوانی کی
انمول نشانی ہے
(عصمت نذیر)

ہانڈی چولہا تک محدود رہنے والی خواتین نے جب قلم اٹھایا تو نہ صرف اپنی محبت بھرے احساسات اور جذبات کو بیان کیا بلکہ عدم مساوات کے خلاف بھی آواز بھی اٹھائی اور مکار سیاست سے ہونے والے نقصانات کی طرف سرعام اشارہ بھی کیا۔جیسے ؎

آ فرق مٹا ڈالیں
سچ سے یہ نفرت کی
دیوار گرا ڈالیں
(ثریا شہاب)

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

ISSN 2320-6519
AKS-E-ADAB *(Quarterly)* Aurangabad.

مردِ مجاہد منظور اثر اور بیڑ کا ادبی پس منظر

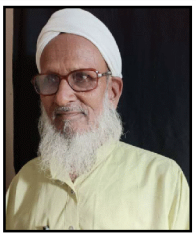

ندیم مرزا (بیڑ)
موبائل : 7744014147

منظور احمد خان اثر ولد شجاعت خان 13 /اپریل 1913ء دیولگھاٹ، ضلع بلڈانہ (ودربھ) میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا اولین حصہ فوج سے وابستہ رہا، شادی کے بعد گھر میں چھ ماہ کی شیر خوار اولاد کو چھوڑ کر برطانوی فوج میں ملازمت اختیار کی، دوسری جنگ عظیم میں خدمات انجام دیتے ہوئے انڈونیشیا، ملائشیا، جاپان، ملایا اور جزائر ساترا میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں . جنگ آزادی شروع ہوئی تو رنگون جا کر نیتا جی سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور مجاہدانہ خدمات و کارنامے انجام دیئے۔ اس ضمن میں اسناد، تمغے اور ایوارڈ بھی ملے مگر افسوس کہ ملٹری ایکشن کی تباہ کاریوں میں سارا اسباب لٹ گیا۔ وطن واپسی کے بعد آر ٹی ڈی حیدر آباد دکن میں بطور ڈرائیور ملازمت اختیار کی اسی دور میں ان کا تبادلہ بیڑ (جو اس وقت ریاست حیدر آباد میں شامل تھا) ہوا اس تبادلے میں آزاد ہند فوج کے دو ساتھی عطاء اللہ خان، قادر خان کے علاوہ حیدر آباد کے دوست محمد جعفر صدیقی اور نیاز محمد خان بھی شامل تھے، ان چاروں میں گہرے دوستانہ مراسم و تعلقات تھے جو آخر دم تک قائم رہے . ریاست حیدر آباد کے انڈین یونین میں الحاق کے بعد حیدر آباد آر ٹی ڈی اسٹیٹ ٹرانسپورٹ، مہاراشٹر اسٹیٹ ٹرانسپورٹ (MSRTC) میں تحلیل ہوئی تو ان چاروں سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ حیدر آباد واپس جانا چاہتے ہیں، چاروں نے مہاراشٹر میں رہنے کو ترجیح دی اور واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ مہاراشٹر نے انہیں حسب حال عہدوں پر بحال رکھا اس طرح بلڈانہ ودربھ کے منظور احمد خان اثر بیڑ (مہاراشٹر) کے ہو گئے اور انھوں نے آخری سانس تک اسی مٹی سے پیار کیا، ان کا انتقال 10/اگست 2007ء کی رات بیڑ ہی میں ہوا۔ خدا کا ان پہ فضل و کرم دیکھئے کہ شب معراج 26 رجب المرجب 1428ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ فوجی ڈسپلن کے پابند منظور احمد خان اثر، ایک اچھے شاعر تھے اور ایک ایک اچھے انسان بھی۔ ہر کوئی انہیں اپنا محسن و مربی سمجھتا تھا۔ ان کے اشعار میں فکر کی گہرائی اور خیال کی نزاکت و ندرت تھی۔

مسجد نہ کلیسا نہ حرم یاد رہے گا
سجدوں کو ترا نقش قدم یاد رہے گا
مل جائے جسے یار کے کوچے کی گدائی
جنت نہ اسے باغ ارم یاد رہے گا
سن کر ہوئے محظوظ اثر تیری غزل ہم
تا دیر تیرا زور قلم یاد رہے گا

اثر جس بہادری کے ساتھ محاذ پر دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑتے تھے، اسی انداز میں سماج میں پھیلی برائیوں کے خلاف وہ صف شکن رہے . شعر کہنا آسان نہیں ہے مگر جب وہ کہنے پر آجاتے تو خیالات کا ایک طویل سلسلہ ان کے سامنے رہتا اور الفاظ دست بستہ ان کے سامنے ہوتے۔ جنگ آزادی کے سنگین حالات، محاذ پر مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ، توپوں کی ساعت شکن گھن گرج اور زخمیوں کی کربناک آہوں نے ان کے اندر بسے شاعر کو سونے نہیں دیا . جنگ کی تباہ کاریوں نے ان کے فن کو اور جلا بخشی۔ انھیں اوج یعقوبی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، ان کے بعد وہ نعیم پاتوڑی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ان کی شاعری میں فلسفی کی سوچ اور صوفی کا مربی انداز چھلکتا ہے۔ فن عروض کا رکھ رکھاو، تڑپتی انسانیت کا کرب اور سوز و گداز ان کی شاعری کا امتیاز ہے۔ عصری حسیت و آگہی کے ساتھ انہوں نے روایتی شاعری کو نہیں چھوڑا، خوبصورت الفاظ کا انتخاب اور خیال کی نزاکت ان کے ہم عصر شعراء میں انہیں ممتاز مقام اور استادانہ مرتبہ عطا کرتی ہے۔ ان کے لہجے کی پختگی سامعین کو اپنے سحر سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتی۔

پھر تجھے تعمیر کرنی ہے جہان خیر کی
پھر اٹھا شمشیر اپنی ، اپنا قرآں پھر اٹھا
سرد ہیں ہنگام حسن و عشق کی سرگرمیاں
اپنے دامن سے شرار سوز پنہاں پھر اٹھا
آگئیں شائد بہاریں سرحد ادراک تک
ہاتھ میرا جانب جیب و گریباں پھر اٹھا

ان کے ہم عصر شعراء میں محمد ضیاء الدین فاروقی ضیاء، بارق پرتوری، نعیم پاتوڑی، نصر اللہ خان آتش، غوث محی الدین سوزاں، شمس جالنوی، یوسف اکمل، سید کریم الدین کمتر، شیخ امام طالب، بشیر الدین بشیر، عبدالقادر فلک، یوسف چشتی، محمد اشرف الدین فاروقی فیضی، محمد اسماعیل قاصر، محمد ابراہیم شاکر، محمد عبدالعلیم ناصر، نور محمد نور اور محمد عبداللہ راہی جیسی قابل ہستیاں شامل تھیں منظور احمد خان اثر کو حضرت محمد اشرف الدین فاروقی فیضی سے شرف بیعت حاصل تھا . ان کے دور میں بڑے بڑے ملک گیر سطح کے مشاعرے منعقد ہوئے۔ بعد میں ترنم کا رواج عام ہوا جس کی وجہ سے اچھی شاعری مفقود ہوتی گئی۔ مندرجہ بالا شعراء کے بعد احسن یوسف زئی، رؤف صادق، سجاد اختر، ظفر خاں ناز، جمیل مرزا، خالق ساغر، خواجہ منظور الدین ایڈوکیٹ یحییٰ خان، نجی اللہ خان، ارشد صدیقی، عبدالرحیم غلام ثاقب نے اپنے اپنے مقام و مرتبے کی حفاظت کی۔ ان میں سے احسن یوسف زئی، رؤف صادق، سجاد اختر، ظفر خاں ناز، خالق ساغر، ارشد صدیقی اور غلام

ثاقب کے شعری مجموعے بھی ہیں۔ شاہ حسین نہری، حمید سہروردی اور شمس جالنوی کا قیام بیڑ میں ضرور رہا مگر ان کا تعلق اورنگ آباد گلبرگہ اور جالنہ سے تھا کافی عرصہ تک تینوں حضرات بیڑ کے ادبی ماحول سے وابستہ رہے۔ بیڑ کی اردو ادبی تاریخ ان حضرات کی ممنون ہے۔ نعیم پاتوڑی سے لے کر حمید سہروردی تک راقم الحروف (ندیم مرزا) رؤف صادق، جمیل مرزا ان ہی کی صحبتوں کے فیض یافتہ ہیں۔ خصوصاً منظور احمد خان اثر کا تعلق مربیانہ رہا، ان ہی کی حوصلہ افزائی کے سبب مرزا عظمت اللہ بیگ سے راقم الحروف ندیم مرزا ہو گیا۔ سرزمین بیڑ اپنے دامن میں ایسے ایسے گوہر نایاب رکھتی ہے جو دور حاضر کے محقق کی تحقیق کا مرکز و محور بن سکتے ہیں۔ علیم الدین علیم کی ہمت و جرائت کو سلام کہ انہوں نے محنت شاقہ سے بکھرے ہوئے ان درخشاں ستاروں کو چن چن کر سمیٹا اور بزم کہکشاں آراستہ کی اور مرہٹواڑہ کے اردو شعراء دو بڑی جلدوں میں ترتیب دے کر آنے والی نسلوں کو گرانقدر تحفہ عطا کر دیا۔ ان سے قبل ڈاکٹر گلناز اور عقیلہ غوث نے بھی اس ضمن میں کامیاب کوششیں کی ہیں اور بھی کچھ نام ہیں جو اس میدان میں کوشاں ہیں جن میں عبدالرحیم غلام ثاقب اور ارشد صدیقی کے ساتھ ساتھ بھارتیہ اردو وکاس فاونڈیشن سولا پور کے صدر سلطان اختر بھی شامل ہیں۔ غلام ثاقب آزاد ہوا کا جھونکا ہیں اِدھر اُدھر کی آمد و رفت سے بکھرے موتی سمیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ انہیں استقلال کی قوت و طاقت عطا کرے ان کے شعری مجموعہ کے ساتھ افسانچوں پر مشتمل کتاب چھپ چکی ہے۔ ارشد صدیقی قد آور شخصیت کے حامل ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، افسانچہ نگاری پر ان کی مضبوط گرفت ہے نئے لکھنے والوں کی تلاش و جستجو، ان کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ نئی نسل میں جمیل مرزا، ڈاکٹر عمران خان، ایڈوکیٹ کلیم الدین، وزیر کلیم الدین، شیخ انیس، مجتبیٰ نجم، سلیم چشتی بیدرد، شیخ محمد عاصم، شیخ واثق ناتھاپوری، شیخ رضوان ناتھاپوری، آصف عالم، پرویز فتح، وسیع پروانہ اور شیخ رابع ثاقب بھی شامل ہیں۔ خصوصاً وسیع پروانہ، شیخ محمد عاصم، شیخ واثق ناتھاپوری اور شیخ رضوان ناتھاپوری نے تو کمال کر دکھایا ہے واضح ہو کہ حصول تعلیم کے لیے مراٹھی اور انگریزی زبانیں ذریعۂ تعلیم رہیں لیکن ان کی شاعری کا بغور جائزہ لیں تو پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تعلیم مراٹھی اور انگریزی میں ہوئی۔ ان کے انداز بیان کی فصاحت و بلاغت بے حد متاثر کرتی ہے، لہجہ کی روانی بھی خوب ہے کسی ماہر فن استاد کی صحبت نصیب ہو جائے تو ان کی شاعری میں بلا کا نکھار آجائے اور حقیقتاً یہی چاروں مستقبل کے وارث حرف و قلم ہوں گے۔ وسیع پروانہ نے اردو شاعری کے ساتھ مراٹھی شاعری میں بھی کامیاب کوشش کی ہے مراٹھی زبان میں ان کے تین شعری مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ صحافت میں نجابت علی عثمانی، فاروق قادری، بشیر احمد خان، رئیس خان اور خالق ساغر نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ دور حاضر میں قاضی مخدوم تعمیر سیاست اور ظفر خان ناز کے جاری کردہ الہلال کو قمر الایمان زندگی دینے کی کوشش کر رہے ہیں سراج خان آرزو اور جاوید پاشاہ بھی اس کارواں میں شامل ہیں خواتین میں عقیلہ غوث، نسرین سحر ہاشمی، بلقیس جمال، حنا کوثر اور عالیہ ترنم اردو ادب کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ اپنے وقت کے ممتاز شاعر منظور اثر نے زندگی بھر کسی کا دل نہیں دکھایا۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا، کیا اپنا کیا پرایا سب انہیں چچا کہہ کر پکارا کرتے تھے، عاجزی، انکساری اور اخلاق حسنہ کی وہ چلتی پھرتی تصویر تھے۔ غزل سے انہیں بے انتہا محبت تھی اس کے علاوہ نعت، نظم، رباعی اور قطعہ پر بھی وہ استادانہ گرفت رکھتے تھے، جنگ کی تباہ کاریاں اور بٹوارے کی خوں افشانی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس مشاہدے اور تجزیے کو وہ اپنے اشعار کے ذریعے پیش کرتے رہے۔ غزل میں روایتی محبوب کا تذکرہ کرتے تو کیا کہنے۔

قیامت کو آنکھوں سے دیکھا نہیں
سنا ہے کہ نقشہ ترا ہو بہو ہے

ان کے اشعار میں ذو معنی کیفیت کے حامل اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ ان کے اشعار میں جا بجا اس جذبہ کا اظہار نمایاں ہے۔ اشعار میں تکرار کا استعمال سماعتوں پر گراں نہیں گذرتا بلکہ کیف و سرور طاری کرتا ہے۔

تقاضہ ہے کہ ہم بھی دیکھیں جلوہ روئے تاباں کا
نور کا، پری کا، ملائک کا، غلماں کا، انساں کا
سفینہ سامنا کرتا ہوا ساحل پہ آ پہنچا
موج کا، دریا کا، تلاطم کا، طوفاں کا

جب وطن عزیز کی حالت دیکھی تو اثر کی روح تڑپ اٹھی اور لب گویا ہوئے۔

اک صبح درخشاں کا تصور تھا ذہن میں
آئینۂ ایام میں تصویر ہے موجودہ
وہ خواب جو دیکھا تھا کبھی حسن چمن کا
صد حیف کہ اس خواب کی تعبیر ہے موجودہ

غیر سے زیادہ ان کے پسماندگان نے ان کے ساتھ ظلم کیا کہ ان کی ادبی وراثت کی حفاظت کی توفیق ایک کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے تینوں نواسے مرزا عبید الرحمٰن بیگ عرف وسیم مرزا، مرزا ذبیح اللہ بیگ عرف فہیم مرزا اور مرزا صفی اللہ بیگ عرف شمیم مرزا نے جتنا ان کے پاس تحریر و زبانی یاد تھا اور کچھ ان کے دوستوں سے یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اللہ ان کی محنت شاقہ کو زیور کتاب سے آراستہ کرے تا کہ بیڑ کے اس مایہ ناز فرزند منظور احمد خان اثر کی یادیں برقرار رہیں۔ رب تعالی ان کو استقامت عطا فرمائے اور خواب دیرینہ شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔ (آمین ثم آمین) ☆☆☆

پھول اور کانٹوں کا شاعر

فوزیہ نسرین (پربھنی)
موبائل : 9890995123

وہ پھولوں میں رہ کر غزل سن رہے ہیں
میں کانٹوں میں سو کر غزل کہہ رہا ہوں

یہ ہے ڈاکٹر یوسف صابر صاحب۔ مکمل نام: یوسف خان ولد جبار خان۔ پیدائش: ۱۷ر مئی ۱۹۶۰ء کالج کی تعلیم کو چھوڑ کر زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہوئے اُن کا ملازمتی سفر ۱۹۸۰ء سے شروع ہوا۔ ۲۸ر برس ہونے کے بعد انھوں نے والینٹری ریٹائرمنٹ لے کر اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر مالیگاؤں (ضلع ناسک) کے ایک کالج میں ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۶ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ وہاں پر انھوں نے طلباء و طالبات کو اردو اور فارسی پڑھائی۔ انھوں نے نوکری کے ساتھ ساتھ اپنا علمی سفر جاری رکھا۔ وہ ایک حوصلہ مند انسان ہیں اور مشفق شخصیت کے مالک بھی۔ فی الحال وہ راجستھان کی جے جے ٹی یونیورسٹی میں اسوسیٹ پروفیسر و گائیڈ بھی ہیں۔ اُن کی نگرانی میں کئی طلباء و طالبات پی ایچ ڈی مکمل کر چکے ہیں۔ اپنے طریقۂ تدریس کی وجہ سے وہ طلباء و طالبات میں بڑے مقبول ہیں۔

۱۹۸۵ء میں ''بنے بوند سے موتی'' شعری مجموعہ شائع ہوا۔ بعد میں مزید کتابیں شائع ہوئیں۔ (۱) جدید شاعری کے ارتقاء میں غیر مسلم شعراء کا حصہ، غیر مسلم غزل گو شعراء۔ ۲۰۱۸ء (۲) مغز ادب (تحقیق) ۲۰۱۸ء (۳) میرے ہم سفر (خاکے) ۲۰۲۰ء (۴) شناسائی (تبصرے) ۲۰۲۲ء۔

آج بھی وہ محنت اور لگن سے اپنی علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ خاکہ نگاری کے لئے صداقت اہم شرط ہے۔ خاکے میں اگر وہ کسی کی خامی بیان کرتے ہیں تو ایسی کہ پڑھنے یا سننے کو بری نہ لگے۔ اختصار ان کی اہم خوبی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''آج کے دور میں وقت کی کمی ہے اس لئے افسانے بھی مختصر ہونے چاہئے۔'' وہ ہر تخلیق کار کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اُن کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، مدیر، صحافی، خاکہ نگار، افسانہ نگار، نقاد اور گلوکار بھی ہیں۔ وہ ایک قابل شخصیت کے مالک ہیں لیکن مزاج بہت سادہ۔ غرور کبھی انھیں چھو کر بھی نہیں گذرا۔ وہ نئے تخلیق کار کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف صابر صاحب رسالہ ''عکسِ ادب'' کے سلسلہ میں ہمارے اسکول ضلع پریشد مانوت میں پہلی مرتبہ آئے تھے۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں افسانے لکھتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنے ''عکس ادب'' میں میرے دو تین افسانے اور آرٹیکل شائع کئے اور میرا بہت حوصلہ بڑھایا۔

☆☆☆

موبائل فون کے معصوم بچوں پر مضر اثرات

محسن خان (حیدرآباد)
موبائل : 9397994441

یقیناً فون آج کی اہم ضرورت ہے اور وقت کا تقاضا بھی ہے۔ یہ شاخِ گل بھی اور تلوار بھی ہے۔ اس کے مثبت استعمال سے جہاں بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں اس کا ذرا سا بھی غلط استعمال ان کے ذہن و مستقبل کو خراب کر سکتا ہے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو موبائیل فون دے کر بے فکر نہ ہو جائیں۔ وقتاً فوقتاً ان کے موبائیل وغیرہ چیک کرتے رہیں اور فون اسکرین لاک نہ رہنے دیں۔ کووڈ کی وباء کے دوران آن لائن کلاسیس کے باعث تمام والدین نے بچوں کو موبائیل فون دلایا تاکہ بچے تعلیم حاصل کر سکیں، لیکن اب آف لائن کلاسیس ہونے کے بعد بھی بچے فون کی لت کا شکار ہیں۔ کئی بچوں میں جنون کی حد تک فون کا استعمال بڑھ گیا ہے اور وہ آہستہ آہستہ جسمانی اور ذہنی بیمار ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی خطرناک نشہ ہے جو بچے کو مکمل تباہ و برباد کر رہا ہے۔ بچے تھوڑی دیر بھی موبائل کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ''پب جی'' اور دوسری گیمنگ کی وجہ سے بچوں میں شدت پسندی آ رہی ہے اور وہ ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر بدتمیزی پر اُتر آ رہے ہیں۔ نیند کی کمی کی بیماری ابھی سے انھیں لاحق ہو رہی ہے اور تعلیم سے بے رغبتی بھی پیدا ہو رہی ہے۔ جسمانی حرکت نہ کرنے کے سبب بچوں کی نشو و نما بھی ٹھیک انداز سے نہیں ہو پا رہی ہے۔ میدان اور گلیوں میں جہاں پہلے بچے کھیلتے نظر آتے تھے وہیں اب سناٹا ہے۔ انھیں دنیا کی حقیقی زندگی اور رشتہ داریوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ چھوٹے بڑے سبھی بچے فون کے استعمال کے سبب سماجی زندگی سے دور ہو رہے ہیں۔ موبائل فون کے سبب بچوں کی دنیا و آخرت دونوں خراب ہونے کے قوی امکانات نظر آ رہے ہیں۔ والدین سے گذارش ہے کہ وہ بچوں کو پہلے جس طرح ٹی وی دیکھنے کے لئے وقت مقرر کرتے تھے اسی طرح موبائل بھی تھوڑی دیر کے لئے دیں اور نصابی، سماجی اور دینی کتابیں پڑھنے کے لئے زور دیں۔

☆☆☆

شریف ارشد کی علمی وادبی کاوشیں

ڈاکٹر عبدالحلیم انصاری (محمد حلیم)
شعبۂ اردو، رانی گنج گرلس کالج (مغربی بنگال)
موبائل : 9093949554

☆خلاصہ (Abstract)

شریف ارشد مغربی بنگال کے ایک مستند و معتبر شاعر اور نقاد تھے۔اردو کے ادبی حلقوں میں ان کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔انہوں نے آسنسول کے ادبی افق پر اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ انہوں نے اردو کے بڑے مرکز سے دور ہوتے ہوئے بھی صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ اس کی شعری روایات، اسلوب اور ہئیت پر پوری دسترس بلکہ قدرت حاصل کی۔انہوں نے آسنسول سب ڈویژن میں علم وادب کے فروغ میں بھی قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔اس مضمون میں شریف ارشد کی علمی وادبی خدمات پر مختصر بات کی گئی ہے۔

☆تعارف (Introduction)

شریف ارشد ایک قابل، لائق وفائق اور مشفق استاد تھے، انھوں نے رحمانیہ اسکول میں تدریسی خدمات بحسن خوبی انجام دیں اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔انہوں نے نہ جانے کتنے دل و دماغ علم کی شمع سے روشن کئے اور انہیں ایک اچھا انسان بنایا۔کئی شاعر وادیبوں کی رہنمائی کی اور ان کی آڑی ترچھی لکیروں کو سنوارا۔کیونکہ وہ اس بات کے متمنی تھے کہ علی گڑھ کی طرح یہاں کے بچوں کے اندر بھی علمی وادبی ذوق بیدار رہے۔اس سلسلے میں شریف ارشد کے ایک شاگرد جلیل عشرت لکھتے ہیں :

''شریف ارشد کے تعلق سے جب کبھی کہیں گفتگو ہوتی ہے تو میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔خیالوں میں فوراً ان کا پُر وقار پیکر زندہ ہو جاتا ہے جسے دیکھ کر قلبی طمانیت محسوس ہوتی ہے اور ان سے وابستہ ڈھیر ساری یادیں اور باتیں ذہن کے گوشے میں کلبلانے لگتی ہے۔ایک دن کلاس میں کہنے لگے 'یہ شہر آسنسول ایک سنگلاخ شہر ہے۔ان کالے پتھروں کے درمیان مجھے گلاب کھلانا ہے۔ تاکہ ادارہ علی گڑھ کی طرح اس اسکول کی بھی ایک تاریخ مرتب ہو سکے کہ فلاں، فلاں، شاعر، افسانہ نگار اور ادیب رحمانیہ اسکول کے پروڈکٹس ہیں۔'' (رسالہ اطلاع عام، آسنسول، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء ص۲۵)

انہوں نے انڈال میں علمی و ثقافتی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا۔ وہ سری پور سے جاری ہونے والے رسالے ''حروف'' کی مجلس ادارت میں بھی شامل تھے۔انڈال میں پہلا آل انڈیا مشاعرہ کروانے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے ۔یہ مشاعرہ ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا جس کی صدارت نذیر بنارسی نے کی تھی۔انہوں نے انڈال میں اردو کا پہلا اسکول قائم کیا جو آج اقبال اکیڈمی ہائر سکنڈری اسکول کے نام سے مشہور ہے۔

☆شریف ارشد کی علمی وادبی خدمات :

شریف ارشد زندگی میں حرکت وعمل کو پسند کرتے تھے اور فطری صلاحیتوں کو روبہ کار لانے پر زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے اپنی شاعری میں عوام کی زندگی کے دکھ درد، مسائل، خواب ، بے گھری، ہجرت اور انتشار جیسے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ان کی شعری تخلیقات ماہنامہ '' شب خون''، ''اقدار''، ''کتاب''، ''مورچہ''، ''آہنگ''، ''روح ادب'' وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ان کی تنقیدی تحریریں ''فکر وآگہی''، '' شب خون''، ''اقدار''، ''کتاب''، ''شیرازہ''، محراب ڈائجسٹ''، ''پہچان''، ''دینی مدارس'' دہلی وغیرہ جیسے معیاری رسائل میں شائع ہوئیں۔انہوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں کہیں۔ان کی غزلوں میں روایتی رنگ غالب ہے۔ابتدائی کلام میں اقبال کا اثر نمایاں تھا۔ابراحسنی گنوری کی شاگردی میں ان کی غزلوں میں تغزل کا رنگ پیدا ہوا۔چند اشعار پیش ہیں ۔

ہم عشق کو حیات کا عنواں نہ کر سکے
کچھ زندگی میں کارِ نمایاں نہ کر سکے

☆

لام کی شکل نہ عارض پہ بکھیرو زلفیں
کافر عشق ہوں اِس لام سے ڈر لگتا ہے

☆

نہ بہار آئے گی پھر تیرے میکدے میں ساقی
ذرا دیکھ میکدے سے تو مجھے نکال کر کے

غزل میں عشق اور احساس تنہائی کے تعلق سے شعروں کے انتخاب میں انہوں نے بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی شاعری کا نمایاں وصف ان کے کلام کی سادگی ہے۔وہ بات کو پیچیدہ بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ راست کہتے ہیں۔محبوب انور ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ کی شاعری تصنع اور تکلفات سے بری ہے۔ آپ نے جو کچھ محسوس کیا بڑی ایمانداری اور سچائی سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے یہاں دیو مالائی واقعات، پریوں کی داستانیں اور غلو کا جذبہ نہیں ہے۔زندگی کے حقائق بغیر نمک مرچ کی آمیزش کے پیش کرنے کا ہنر انھیں معلوم تھا۔'' (چہرہ چہرہ از قلم محبوب انور، پہچان پبلی کیشنز، الٰہ آباد، ۲۰۰۹ء، ص۴۳)

شریف ارشد کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری شاعر کو بے دخل کر کے خود اپنے آپ کو شاعر کا قائم مقام بنا لیتا ہے۔اسے ایسا لگتا ہے جیسے شعر میں بیان کیا گیا تجربہ شاعر کا نہیں بلکہ خود اس کا اپنا تجربہ ہے۔جیسے ۔

رشکِ جنت بنادوں عالم کو
کیا کروں پر حیات ہی کم ہے

☆

طوفِ کعبہ کریں یا فکرِ معاش
کس قدر بے قرار ہیں ہم لوگ

شریف ارشد نے عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ یہ نظمیں پابند بھی ہیں اور آزاد بھی ہیں مگر ان سبھی نظموں میں خیالات کی گہرائی اور علمیت آشکار ہے۔ان نظموں میں انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کا اظہار بے باکی سے کیا ہے۔ان کی نظم ''مغربی بنگال کی یہ لڑکیاں کسان ہیں'' یہ ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ کھیت کاٹتی ہوئی جھکی جھکی یہ لڑکیاں
یہ دانہ ڈالتی ہوئی اداس اداس دیویاں
یہ میلی میلی چولیاں یہ بھیگی بھیگی ساڑیاں
یہ ہونٹ چاٹتی ہوئی دکھوں کی شاہ زادیاں
کتاب زندگی کی یہ سوالیہ نشان ہیں

یہ نظم ایک پچھڑے ہوئے طبقے کی امنگوں وآرزوؤں، خواہشوں، جذبوں، کمزوریوں و کجرویوں کا اظہار یہ ہے۔اس میں فطری دلکشی ،تازہ کاری اور حقیقت نگاری درجۂ کمال کو چھوتی نظر آتی ہے۔ یہ نظم معنوی خصوصیات کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کے ان گنت امکانات کو روشن کرنے کی قوت سے بھی مالا مال ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں اپنے موضوعاتی تنوع۔وسیع کینواس اور منفرد وشگفتہ انداز و بیان کے اعتبار سے دل ودماغ کو اپنا گرویدہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ شریف ارشد نے نظم ونثر دونوں میں اپنی حلاحیتوں کا لوہا منوایا اور قومی سطح کے شاعروں اور نقادوں کی صف میں شامل ہوئے۔بقول محبوب انور'' آپ کے تنقیدی مضامین آپ کی علمی و ادبی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔'' شریف ارشد کے تنقیدی افکار نے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں سے داد وتحسین وصول کی۔ انہوں نے بشیر بدر،صلاح الدین پرویز،حامدی شیرازی،علی سردار جعفری وغیرہ پر عمدہ تنقیدی مضامین لکھے جو ادبی حلقے میں کافی سراہے گئے۔ان کے مضمون ''بشیر بدر: ایک مطالعہ'' سے ایک اقتباس پیش ہے۔

'' بشیر کی شاعری میں وجودیت کے نمایاں اثرات ہیں۔انسان اور انسانی مسائل ان کے شعری تجربات کے مراکز ہیں۔ان مسائل کی طرف ان کا ذہنی رویہ اور اسلوب خالص وجودی ہے۔وہ انتہائی بے باکی اور جرأت ابراہیمی سے عہد حاضر کے سیاسی وسماجی بتوں کو منہدم کرتے چلے جارہے ہیں۔ان کا ایمان ہے کہ بحیثیت انسان کے انسان میں دلچسپی لینا فرض ہے۔وجود اگر وجود کے کرب اور دکھوں سے ہمدردی نہیں رکھتا تو پھر وجود کی معنویت کیا رہ جاتی ہے۔''

(بشیر بدر: ایک مطالعہ۔از: شریف ارشد مشمولہ ''فکر و آگہی'' اکتوبر ۱۹۹۷ء)

☆ماحصل

مندرجہ بالا اقتباس سے شریف ارشد کے تنقیدی افکار اور ان کی زبان واسلوب کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شریف ارشد نے اپنے تنقیدی افکار سے بنگال کی ادبی تنقید کو قومی پہچان عطا کی۔مختصر یہ کہ شریف ارشد ایک باکمال شاعر،کامیاب محقق،بیباک نقاد اور ایک مشتاق وپختہ کار ادیب تھے۔ان کی تحریروں کی اہم خصوصیات میں حق گوئی،بیباکی اور توازن ہے۔ان کی شہرت و مقبولیت اگرچہ بحیثیت شاعر ہے لیکن ان کی اردو نثر نگاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔آپ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور صاحب طرز نثر نگار بھی گویا کہ آپ اردو ادب کے آل راؤنڈر ہیں۔ بنگال کے شعر و ادب کو نکھارنے ، سجانے اور سنوارنے میں انہوں نے اپنا خون جگر صرف کیا۔لہٰذا، بنگال کی ادبی تاریخ ان کے نام کے بغیر ادھوری رہے گی۔

☆☆☆

(نظم)

آہ فلسطیں

سراج زیبائی
(شیموگہ۔کرناٹک)
موبائل :
8296694020

خون میں ڈوبی فلسطیں کی مقدس سرزمیں
ایسا منظر خوں چکاں ہم نے تو دیکھا ہی نہیں

کیسے ہوں گے ان درندوں کے وہ فولادی جگر
جو کچل دیتے ہیں معصوموں کے بے رحمی سے سر

کتنے مظلوموں کی لاشوں کے لگے انبار ہیں
دیکھ کر چپ چاپ سارے ملک کے غدار ہیں

اس زمیں پر بوجھ بن کر جی رہے ہیں سب یہاں
خواب غفلت سے سبھی جاگیں گے آخر کب یہاں

ان کی حالت دیکھ کر بس خون روتے ہیں سبھی
اُف یہ کیسی بے حسی مسلم ممالک کی رہی

کب تلک یہ خون ناحق دیکھتے جائیں گے ہم
کب تلک ہوں گے یوں ہی معصوم بچوں پر ستم

بربریت ختم کب ہوگی یہ اسرائیل کی
داستاں کب ختم ہوگی ابرہہ اور فیل کی

مسجد اقصیٰ کو گرنے سے بچانا ہے ہمیں
ظلم جتنا بھی ہے دنیا سے مٹانا ہے ہمیں

☆☆☆

☆☆☆☆

گوشۂ ڈاکٹر عظیم راہی

افسانچہ نگار ایک نظر میں

مکمل نام : محمد عظیم الدین

والد کا نام : محمد سلیم الدین صاحب (مرحوم)

قلمی نام : ڈاکٹر عظیم راہی

تاریخ پیدائش : 19/جون 1958ء

تعلیمی لیاقت : (۱) بی ایس سی (ریاضی)

(۲) ایم اے (اردو مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد)

(۳) پی ایچ ڈی (اردو) سنت گاڑگے بابا امراوتی یونیورسٹی امراوتی

مصروفیت: موظف (جونیئر انجینئر۔محکمہ مواصلات اورنگ آباد)

تصانیف : (۱) پھول کے آنسو (افسانچے) 1987ء

(۲) اگلی صدی کے موڑ پر (افسانے) 1996ء

(۳) درد کے درمیاں (افسانچے) 2002ء

(۴) **ریزہ ریزہ دل**۔نذیر فتح پوری۔مرتب: عظیم راہی 2006ء

(۵) اردو میں افسانچہ کی روایت۔تنقیدی مطالعہ 2008ء

(۶) پل صراط۔سکندر حمید عرفان۔مرتب: ڈاکٹر عظیم راہی 2013

(۷) محبوب ونذیر، فنکار بے نظیر 2013ء

(۸) اپنے دائرے کا آدمی (افسانے) 2014ء

(۹) اردو افسانچے کی مقبولیت اور پیش رفت۔ایک مطالعہ 2015ء

(۱۰) آب اور آگ (تبصرے، تجزیے) 2016ء

(۱۱) چہرہ چہرہ پہچان (افسانے) 2017ء

(۱۲) کل اور آج کا غم (افسانچے) 2020ء

(۱۳) نقد ونظر کے درمیان (تبصرے اور مضامین) 2020ء

(۱۴) برار کے گوہر قدیم 'اکبر وسیم' 2022ء

(۱۵) طرز بیاں اپنا (خاکہ نما اور خاکے) 2023ء

زیر ترتیب کتابیں

(۱) مراٹھواڑہ میں اردو افسانہ، ایک انتخاب (۲) آج بجوکا؟ (افسانچے) (۳) باتوں باتوں میں۔(ریڈیائی ڈرامہ نما گھریلو موضوعاتی سلسلے) (۴) خطوط میرے۔مدیران کے نام (۵) دکھ بولتے ہیں (نثری نظمیں) (۶) جوگندر پال۔بحیثیت افسانچہ نگار (۷) مہاراشٹر

ڈاکٹر عظیم راہی۔مختصر تعارف

کے صاحب کتاب افسانچہ نگار۔ حیات و خدمات (۸) آئینے کے روبرو (انٹرویو اور رپورتاژ) (۹) آن لائن رشتے (افسانے) (۱۰) وہ جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں (تاثراتی وتعزیاتی مضامین) (۱۱) مہاراشٹر میں اردو افسانچہ۔سمت ورفتار اور صورتحال (۱۲) فکر ونظر کے آئینے (تبصرے اور مضامین) (۱۳) آئینے اور عکس (افسانچوں اور افسانچوں کے تجزیے)

انعامات و اعزازات (۱) کالج میگزین کمپیٹیشن میں مراٹھواڑہ یونیورسٹی کی جانب سے افسانہ "جاگتی آنکھوں کے خواب" کو انعام اوّل

(۲) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی جانب سے افسانوی مجموعہ "اگلی صدی کے موڑ پر" کو پہلا انعام

(۳) غالب کلچرل اکیڈمی (بنگلور) سے کرشن چندر اعزازی ادبی ایوارڈ

(۴) ملک کے تقریباً تمام ادبی ونیم ادبی رسائل وجرائد اور اخبارات میں افسانے، افسانچے، تبصرے وتجزیے، تاثراتی اور تحقیقی وتنقیدی مضامین کی اشاعت۔اس کے علاوہ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے افسانے، ریڈیائی فیچر اور گھریلو موضوعاتی خاکے نشر ہوئے ہیں۔

(۵) ہندوستان کے مختلف صوبوں کے اہم شہروں ممبئی، ناگپور، بھیونڈی، پونا، جلگاؤں، میرٹھ اور علی گڑھ میں منعقدہ سیمیناروں اور محفل افسانہ میں خصوصی شرکت۔

(۶) سہ ماہی 'تکمیل' (بھیونڈی) اور 'شاعر' (ممبئی) نے فن اور شخصیت پر خصوصی گوشے شائع کیے۔

(۷) اسباق پبلی کیشنز پونا نے "اسباق ادبی ایوارڈ" برائے ۲۰۱۰ء تفویض کیا۔

(۸) سہ ماہی 'تکمیل' (بھیونڈی) 'مشتاق مومن فکشن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

(۹) ضلع عثمان آباد کی ایک طالبہ نے 'عظیم راہی۔بحیثیت افسانہ نگار' ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ پیش کیا۔

(۱۰) فردوس احمد بھٹ، حیدرآباد یونیورسٹی میں عظیم راہی۔بحیثیت منی افسانہ نگار ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھا۔جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

(۱۱) انجمن ترقی اردو ہند شاخ مالیگاؤں کا 'وقار ادب ایوارڈ'

(۱۲) انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن آف انڈیا کا (مالیگاؤں) کا 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'

(۱۳) 'اپنے دائرے کا آدمی' کو اتر پردیش اردو اکیڈمی اور مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

(۱۴) ادارہ ادب اسلامی ہند (مہاراشٹر) کی جانب سے ۲۰۲۲ء عصمت جاوید ایوارڈ برائے نثری خدمات دیا گیا۔

صحافت: (۱) روزنامہ 'مفسر' کے ادبی صفحہ میں "افسانچہ نمبر" کی اشاعت میں معاونت

(۲) روزنامہ 'رہبر' کے ادبی صفحہ میں "اس ہفتہ کا افسانہ نگار" کالم کی ترتیب وتدوین

(۳) ماہنامہ 'بیباک' (مالیگاؤں) کی مجلس مشاورت میں شمولیت

(۴) سہ ماہی 'اسباق' (پونہ) کی مجلس مشاورت میں شمولیت

(۵) دوماہی 'افسانہ نما' (کڑپہ) کی مجلس مشاورت میں شمولیت

(۶) سہ ماہی 'عکس ادب' (اورنگ آباد) مجلس مشاورت میں شمولیت

پتہ: عابدہ منزل، گھر نمبر 4-11-279/44 نزد مدینہ مسجد، کریم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد۔431001 (مہاراشٹر) رابطہ: 9370992203

☆☆☆

گوشۂ ڈاکٹر عظیم راہی (مضامین)

افسانچہ پر، عظیم راہی کا ایک اہم کارنامہ

پروفیسر عتیق اللہ
صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

عظیم راہی، ادب کے ایک سنجیدہ قاری ہیں۔ وہ خود تخلیق کار ہیں۔ جن کے افسانوں اور افسانچوں سے اردو کے قاری کو گہری واقفیت ہے۔ وہ اردو کے واحد افسانہ نگار ہیں جن کے تین افسانچوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کھاتے میں ایک افسانوں کا مجموعہ ''اگلی صدی کے موڑ پر'' بھی ہے جو ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ ایک تخلیق کار کے لیے یہ بڑے چیلنج اور حوصلے کی بات ہوتی ہے کہ وہ اس صنف کی تاریخ اور فن کی چھان پھٹک بھی کرے، جس میں وہ خود لکھتا چلا آرہا ہے۔ چوں کے عظیم راہی، آپ اپنے میں ایک اہم اور قابل ذکر افسانچہ نگار ہیں۔ گذشتہ کم وبیش ۲۵ برسوں سے جس صنف کے ساتھ تخلیقی وابستگی برقرار رکھی ہے وہ افسانچہ ہی ہے۔ انھیں اس صنف کے سارے رموز کا گہرا علم ہے۔ ان کے تجربات عملی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ ہماری توجہات کو برانگیخت کرتے ہیں نیز یہ کہ عظیم راہی کا طریق استدلال شبہات کو رفع ہی نہیں کرتا بلکہ مناسب حوالوں کے ذریعے اطمینان بخش حد تک قائل معقول کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ انھوں نے تاریخ اور فن کے تعین میں کہیں بھی متمرد رویہ اختیار نہیں کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک تخلیق کار بلکہ اعلیٰ پائے کے تخلیق کار ہیں۔ اس بنا پر ان کی تنقید، منبر کی خطابت سے دو چند دور ہے۔ وہ ہمارے بعض پیشہ ور نقادوں کے اس عصا کو کام میں لینے سے گریز کرتی ہے جو صرف ڈرانے دھمکانے کے کام آتا ہے۔ عظیم راہی نے اس صنف کو موضوع بحث بنایا ہے، جس پر گفتگو تو ہوتی رہی، مجموعاً اس کے تاریخی اور فنی پہلوؤں کو بنیاد بنا کر کسی نے اتنے بڑے کام کا منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ یوں بھی اصنافی تنقید کا GENRE CRITICISM باب ہمارے یہاں خالی ہے۔ ایک سطح پر بعض اجزاء کے اعتبار سے تمام ادبی اصناف ایک دوسرے میں خلط ملط ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی جن فنی تدابیر کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، ان کا اطلاق کم وبیش ہر صنف پر ہوتا ہے۔ تکنیک ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی روشنی میں ہم مختلف اصناف کے مابین مغائرتوں کا ایک خاکہ مرتب کر سکتے ہیں۔ عظیم راہی نے افسانچے کے فنی لوازمات کے ضمن میں تکنیک کو بنیادی حوالہ بنایا ہے۔ موضوع و مواد یا پلاٹ کے عمل کی روایتی بحثوں کے بجائے ان تقاضوں پر غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ جن کی نوعیت میں ہر صنف کے ساتھ فرق واقع ہو جاتا ہے۔ عظیم راہی یہ بخوبی جانتے ہیں کہ تفصیل کے مقابلے میں اختصار اور ایجاز کا فن نسبتاً آزمائشی ہوتا ہے۔ تصویر کے مقابلے میں تصویر چہ کے فن کو بھی اسی بناء پر دشوار گذار کہا گیا ہے کہ وہ جتنا ظاہر میں اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے اس سے زیادہ وہ اپنے باطن میں ہوتا ہے۔ افسانچہ بھی ایک ایسا ہی مختصر کاری کا فن ہے جو کم سے کم لفظوں میں قاری کی سوئی ہوئی تخلیقیت کو زیادہ سے زیادہ تحریک بخشتا ہے۔ اس میں ان کہے عناصر Unsaid elements کی بہتات ہوتی ہے۔ اسی لیے متن کے بجائے اس کا تحت المتن (sub-text) زیادہ توجہ خیز ہوتا ہے۔ یہ تحت المتن وہ ہوتا ہے جو صرف اور صرف قاری کی ملکیت ہوتی ہے۔

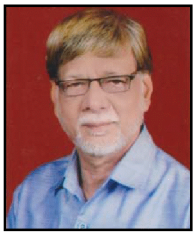

اس معنی میں ہر اچھا افسانچہ کسی نہ کسی سطح پر منصفانہ متن کا حامل ہوتا ہے اور قاری کے لیے اس میں ازسرنو خلق کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

عظیم راہی کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ان کی طبیعت میں جو تحمل، جستجو میں جو استقلال اور جذبات میں جو یکسوئی، ارتکاز اور معصومیت پائی جاتی ہے، دوسروں میں ان چیزوں کا بڑا فقدان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ انھوں نے جو سوالات قائم کیے ہیں مدتوں وہ بحث کا موضوع بنے رہیں گے۔ ☆☆☆

اقتباس : ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل

''ہمارے یہاں سب سے پہلے سعادت حسن منٹو نے سیاہ حاشیے کے عنوان سے مختصر ترین افسانے سپرد قلم کیے۔ یوں اردو میں اس صنف کی بنیاد استوار ہوئی۔ لیکن یہ صنف آج بھی سب کے لیے یکساں طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ بیشتر اُدبا اسے افسانے سے الگ صنف تسلیم نہیں کرتے اور کچھ ایسے ہیں جو افسانچہ کو قابل اعتنا نہیں گردانتے۔ ایسے میں عظیم راہی کی کتاب ''اردو میں افسانچہ کی روایت۔ تنقیدی مطالعہ'' افسانچے کے استحکام کے لیے بیش قیمت اقدام ہے۔ عظیم راہی گذشتہ ۲۵ سالوں سے افسانچہ سے قلبی وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کے افسانچوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اب انھوں نے پہلی بار اس صنف کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔'' (مطبوعہ سہ ماہی ''فکر و نظر'' نظام آباد۔ نومبر ۲۰۰۹ء تا فروری ۲۰۱۰ء)

AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.
ISSN 2320-6519

میں چشم دید گواہ ہوں کہ

(ڈاکٹر) محبوب راہی (بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ)
موبائل : 9421751064

''اردو میں افسانچے کی روایت'' یہ کتاب افسانچہ نگاری پر پہلا بڑا کام ہے۔ جس پر مجھے چند سطریں لکھنے کا موقع میسّر آیا ہے۔ مصنف کی کم وبیش ایک چوتھائی صدی کی مسلسل تلاش وجستجو، متحققانہ عرق ریزیوں، مخلصانہ کاوشوں، عاشقانہ سرگرمیوں، منفرد تخلیقی تجربوں، برسہابرس کے عمیق مطالعے کے نتیجے میں حاصل شدہ تنقیدی بصیرتوں کے دیانتدارانہ تجزیوں نیز مسلسل متجسس افتادِ طبع کا ثمر شیریں ہے کہ موصوف تخلیقی راستوں پر میرے بے حد دیرینہ ہمسفر ہیں اور میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کے اوبڑ کھابڑ، پیچ در پیچ اور سنگلاخ راستوں پر قدم قدم ان کی ماہرانہ اور محتاط تیز گامی نیز نئی نئی منزلوں کی جستجو میں ان کی مسلسل پیش قدمی کا برسوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔

عمروں اور چند ادبی رویوں میں مماثلت کے علاوہ ہمارے درمیان ایک واضح فرق یا فصل ادبی رجحانات کی ہم آہنگیوں کا تھا۔ میں ٹھہرا خالصتاً کلاسیکی مزاج کا حامل، روایت کا پاسدار۔ جدیدیت سے ہم رشتگی محض خیالات اور لب ولہجے کی حد تک۔ جدیدیت کے نام پر تجریدیت اور مجنونانہ علامت نگاری سے برگشتگی نے مجھے ہر نئے تجربے سے تقریباً متنفر کر رکھا تھا اور میں اپنے اس انتہا پسندانہ رویے کے تحت علامتی افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے سے بھی دوری بنائے ہوئے تھا۔ صورت حال کا ایک عجیب پہلو یہ بھی تھا کہ افسانچے سے ناپسندیدگی کے باوجود عظیم راہی جیسے اہم اور قابل ذکر افسانچہ نگار سے نبھ رہی تھی اور خوب نبھ رہی تھی اور اس نبھاؤ کی بنیادی وجہ تھی عظیم راہی کے افسانچوں میں افسانویت یا کہانی پن۔ بالفاظ دگر افسانے کے ان تمام لوازمات کا اہتمام جو بچپن ہی سے میرے ذہن وشعور پر کہانیوں، افسانوں، ناولوں یا داستانوں نے اپنی گرفت قائم رکھی تھی۔ میں افسانہ نگار تو خیر معمولی درجہ کا بھی نہیں البتہ افسانے کے قاری کا بھی اگر کوئی مقام ومعیار ہوسکتا ہے تو میں انشاء اللہ ایک اعلیٰ درجے کے معیاری قاری کو کسوٹی پر بہ ہر اعتبار پورا اتروں گا۔ اس لیے کہ سب افسانے کم وبیش تمام بنیادی لوازمات یا عناصر ترکیبی مثلاً پلاٹ، کردار، فارم، موضوع، داد، تمثیل، علامت، اساطیر، تکنیک، تھیم، امیج، استعارہ، مرقع، منظر نگاری، مقام، ماحول، فضا، پس منظر، ڈرامائیت، لب ولہجہ، اسلوب اور لسانی ساخت وغیرہ کہاں کہاں۔ کس کس مناسبت سے روبہ عمل لانے میں کیا کیسی اور کتنی فنّی مہارت درکار ہوتی ہے اس کا تھوڑا بہت علم وادراک ضرور رکھتا ہوں اور وہ عنصر جو کہانی کی جان ہوتا ہے اور جس کا میں دل وجان سے والہ وشیدا ہوں وہ ہے کہانی پن اور یہ کہانی پن چاہے داستان میں ہو، ناول میں ہو، افسانے میں یا افسانچہ میں اس کی مثال ریشم کے کیڑے کی سی ہے جو اپنے اردگرد تھان کے تھان ریشم بن کر اسی میں اندر ہی اندر اپنے وجود کو ضم کر دیتا ہے۔ یہ کہانی پن کہانی کے ایک باب، ایک صفحے، ایک پیرگراف یا ایک جملے میں بھی سمویا ہوسکتا ہے اس کے آس پاس واقعاتی تسلسل کے ساتھ چند حقائق، کچھ زیب داستاں کے لیے ان تمام کے متناسب اور متوازن اشتراک باہم سے افسانچہ، طویل افسانہ، ناول یا داستان کے تانے بانے بنے جاتے ہیں ورنہ کہانی کی دنیا تو اسی ایک باب، صفحے، پیرگراف یا جملے میں آباد ہے۔

تحقیق وتنقید کے خارزاروں میں فکر کے تلوے مسلسل لہولہان کرتے ہوئے عظیم راہی کے پاس افسانچوں کے مجموعوں، اس صنف پر اخبارات ورسائل کے خصوصی نمبروں، مضامین، مباحث اور مکاتیب کا معتد بہ ذخیرہ یکجا ہوگیا تو ایک لمبی جست لگا کر تمامتر امکانی بلندیاں سر کرنے اور افسانچہ کے فن کو دنیائے ادب میں مقام، وقار واعتبار عطا کرنے کی دھن ان کے سر میں سمائی اور انھوں نے زیر نظر کتاب ''اردو میں افسانچہ کی روایت'' ترتیب دے کر منظر عام پر لانے کا بیڑہ اٹھایا۔ دل میں خلوص تھا، اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا، اپنے مطالعہ کا اعتبار تھا، ارادوں میں پختگی تھی، حوصلوں میں توانائی تھی لہٰذا وسائل کے فقدان کے باوجود محض اللہ کے بھروسے کشتی مسائل کے منجدھار کے حوالے کردی جو متذکرہ مثبت اوامر کی بنا پر اس منفرد اور بے مثال کتاب کی صورت میں کامرانیوں سے انھیں ہمکنار کرنے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کتاب کے وسیلے سے عظیم راہی نے افسانچہ کے تعلق سے عام غلط فہمیوں اور تہمتوں بالخصوص اسے لطیفہ یا اخباری خبر کہہ کر مطعون کرنے کے الزامات کے سدباب کے لیے مضبوط، ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل کی روشنی میں صحت مند بحثیں کی ہیں۔ بے شمار مثالوں کی مدد سے اپنے دلائل کی صحت مندی، معقولیت اور مبنی بر صداقت ہونے کے جواز عظیم راہی نے پیش کیے اس کتاب کی روشنی میں افسانچہ کی وجودیت کا منکر اور اس کا کٹّر سے کٹّر مخالف بھی اس کی اہمیت اور افادیت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگا۔

عظیم راہی کی ان تحریروں کا ہر منظر ان کی محنت شاقہ کا گواہ ہے۔ ہر جملہ ان کی محققانہ دیانتداری کا آئینہ دار ہے۔ ہر سطح سے ان کی تنقیدی بصیرت مترشح ہے اور پھر تخلیقی شان ان سب پر مستزاد۔ یہ سارے اوصاف ان کی برسہابرس کی انتھک جدوجہد، پرخلوص محنت اور خداداد غیر معمولی اور ہمہ جہت صلاحیتوں کے نتیجے میں عالم ظہور میں آتے ہیں۔ یہ سب کچھ میں مکمل اعتبار اور کامل اعتماد کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اس تمام منظر نامے کا میں چشم دید گواہ ہوں۔

اپنے آپ میں منفرد اور مکمل اردو شعر وادب میں افسانچہ کے فن پر اس اولین تنقیدی وتحقیقی کارنامے پر میں عظیم راہی کو بہ صمیم قلب ہدیہ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہوں اس پرخلوص دعائیہ پیش گوئی کے ساتھ کہ یہ کتاب انھیں اس فن پر اولیت کا شرف عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر نقد وبصیرت کی نو بہ نو راہیں کھولنے کا موجب بھی ہوگی۔

☆☆☆

گوشۂ ڈاکٹر عظیم راہی (مشاہیر قلم کے منتخب اقتباسات، ڈاکٹر عظیم راہی کی افسانچہ نگاری کے ضمن میں)

جوگیندر پال

''عظیم راہی نے اپنی سالہاسال کی محنت اور لگن سے افسانچے کی روایت کا یہ نہایت مفید تنقیدی مطالعۂ پیش کیا ہے۔ان کے اس مطالعۂ میں جہاں بیشتر نکات کی وضاحت بڑے استناد سے کی گئی ہے وہاں ایک آدھ مقام پر شاید بات کو مزید تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے، مثلاً بعض قارئین کی یہی شکایت، کہ کئی ایک افسانچہ نگار اپنے افسانچے میں لطیفہ سا پیش کر کے رہ جاتے ہیں۔اس تعلق سے ہمیں لطیفے کے تار و پود پر بھی غور کرنا ہوگا۔لطیفے کے حسن میں بھی افسانچے کے مانند اس کا چست بیان اور وقوعی اختصار کارفرما ہوتا ہے، مگر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ لطیفے اور افسانچے کے اس یکساں پہلو کے باوصف ہم صرف افسانچے کے چھتے اور چوبند اختصار میں ہی اپنے دکھ وسکھ یا صرف دُکھ کی جھلملاتی روشنی میں اَن کہے آگے پیچھے کو بھی جا لیتے ہیں۔بہرحال عظیم راہی کی یہ کتاب افسانچے کے مطالعۂ میں پہلا باقاعدہ تنقیدی باب ہے' اور یہ تنقیدی باب اتنی سرگرم ذمہ داری سے لکھا گیا ہے کہ اس کی ستائش میں بخل سے کام لینا کوتاہی کے مترادف ہوگا۔راہی خود آپ بھی ایک اچھے افسانچہ نگار ہیں اور یوں اُن کا راست تخلیقی تجربہ بھی اُن کی ناقدانہ دریافت میں اُن کا معاون رہا ہے،......اور اس سے بھی بڑھ کے، اُن کی یہ نہایت محبوب چاہ اور چاہ میں اس گنجائش کا پورا اہتمام، کہ آپ بھی اُن کے ساتھ سر جوڑ کر سوچیں اور اپنے نتائج خود آپ اخذ کریں۔ مبارکباد، عظیم راہی!'' (تصنیف: اردو میں افسانچہ کی روایت' تنقیدی مطالعہ۔پیش لفظ سے ماخوذ) ☆

نورالحسنین (کل اور آج کا غم)

''ڈاکٹر عظیم راہی گذشتہ چالیس برسوں سے ادب کی زمین پر کسی چٹان کی طرح جمے ہوئے ہیں۔اُن کی شناخت بحیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ انھوں نے افسانچے بھی لکھے اور خوب لکھے، تنقید بھی لکھی لیکن مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ عظیم راہی کا پہلا عشق کس سے ہے تو میں کہوں گا افسانچہ نگاری سے رہا ہے۔ادب کے گلیاروں میں وہ داخل بھی ہوئے تو افسانچوں کے ساتھ۔ بعد میں افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے، تنقید نگاری سے دل بھی لگایا تو پہلے افسانچوں کی طرف جس کا نتیجہ افسانچہ کا فن اور اُس کی روایت اور مقبولیت پر دو تنقیدی کتابیں لکھیں۔اُن کی ذوق کو دیکھتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی روایت کے مطابق' میں نے 'بابائے افسانچہ' کہا تھا، اسی لقب سے ادبی حلقوں میں وہ یاد کئے جاتے ہیں۔افسانچوں کا اُن کا تازہ مجموعہ 'کل اور آج کا غم' نہایت عمدہ' بامعنی اور بھرپور تاثرات سے لبریز افسانچوں کا گلدستہ ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے، سماجی اور معاشی گرہیں بھی کھولتا ہے۔سیاسی جبر اور حالات حاضرہ کا آئینہ دکھاتا ہے۔ بدلتی' مٹتی قدروں کا نوحہ گر بھی ہے۔ مذہبی' تہذیبی روایتوں کا امین بھی ہے اور مستقبل کی راہیں بھی دکھاتا ہے۔ اِس مجموعہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔'' (فیس بک سے ماخوذ۔۱۸/اکتوبر ۲۰۲۰ء)

☆☆☆

اسلم مرزا

''اردو میں افسانچہ کی روایت' کو ڈاکٹر راہی تنقیدی مطالعہ کہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صرف تنقیدی مطالعہ نہیں، بلکہ نہایت اہم تحقیقی کام ہے اور اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ انھوں نے اپنی کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جس سے ان کی دلچسپی، انہماک اور فکر و تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے جو مواد جمع کیا ہے وہ افسانچہ کی روایت کو نہایت مثبت طریقے سے آگے بڑھتا ہوا دکھاتا ہے۔ وہ سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' کو افسانچہ کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔منٹو کا یہ مجموعہ جو ۱۹۴۸ء کے فسادات سے پیدا شدہ واقعات کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ڈاکٹر عظیم راہی نے ایک اور قابل قدر کام یہ بھی کیا ہے کہ ۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۸ء کے درمیان ان تمام افسانچوں کے مجموعوں کی فہرست شائع کر دی ہے جس میں ان مجموعوں اور افسانچہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔اسی طرح انھوں نے زیر ترتیب مجموعوں کی فہرست بھی شامل کی ہے۔اس کے علاوہ ہمیں مشترکہ افسانوی مجموعے سے بھی روشناس کر دیا۔ یہ فہرست سازی نہایت محنت سے کی گئی ہے اور اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ انھوں نے یہ بڑا کام کیا

ہے۔ ڈاکٹر راہی نے منی افسانہ، منی کہانی اور افسانچہ نمبر کے سلسلے میں تمام رسائل اور اخبارات کی بھی فہرست دی ہے۔ میں مکمل اعتماد کے ساتھ یہ بات کہنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا کہ ڈاکٹر عظیم راہی کی کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور اردو کے طالب علموں کے لیے ایک بیش بہا خزانہ بھی۔ میں اس عظیم کام کے لیے ڈاکٹر عظیم راہی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ہمیں افسانچہ نگاری اور اس کی ترقی و ترویج سے متعلق اپنی گفتگو میں شریک رکھیں گے۔'' (ماہنامہ 'فنون' اورنگ آباد۔ جنوری ۲۰۱۰ء) ☆☆☆

عارف خورشید

بہت سے افسانہ نگار منی کہانیاں/ افسانچے لکھ رہے ہیں۔ عظیم ان سب میں بہ آسانی اپنے لب و لہجہ اور انداز بیان کی وجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان کا چیزوں کو دیکھنے اور اس کے زیر اثر منی کہانی/ افسانچہ کے قالب میں ڈھالنے کا انداز قاری کو نئے ذائقے سے روشناس کرتا ہے۔ عظیم کا مشاہدہ وسیع' مطالعہ مرتب' فکر مختلف' سرمایہ ہر لمحہ حاوی۔ دیکھنے والوں کو وہ تنہا پیدل دکھائی دیتے ہیں مگر میں نے دیکھا ہے منی کہانیاں/ افسانچے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دماغ کہانیوں کے تانے بانے بنتا ہے اور قدم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اپنی منزل کے راہی جو ٹھہرے۔ ادب کا راستہ جو زندگی سے ہو کر گزرتا ہے اس پر ثابت قدم ہیں، تھے اور رہیں گے۔ کیونکہ ۔

جب عزم سلامت ہے تو ہے اس کا یقیں بھی
منزل مرے قدموں سے بہت دور نہیں ہے

''اردو میں افسانچہ کی روایت' ان کا بڑا کارنامہ ہے' بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ افسانچہ/منی کہانی کا سنگ میل ہے۔ منی کہانیوں/ افسانچوں پر آئندہ جو بھی قلم اٹھائے گا وہ عظیم راہی کو نظر انداز کر کے اپنے دعوے کو دلیل تک نہیں پہنچا پائے گا' یہ میرا دعویٰ ہے۔'' (کل اور آج کا غم کے پیش لفظ سے ماخوذ) ☆☆☆

افتخار امام صدیقی (مدیر 'شاعر')

''اردو افسانچہ تاریخ میں پہلی بار ایک ان چھوا موضوع ڈاکٹر عظیم راہی کے تخلیقی ذہن نے اپنی سوچ کے کینوس پر کتاب بند کر دیا ہے۔ ایسا کام خال خال ہی ممکن ہے ورنہ تو فرسودہ اور قینچی + گوند ایسے کاموں کے سمندر سے کوئی موتی نکالنا آسان نہیں تھا لیکن عظیم راہی نے اپنی تحقیق پیرا کی کے بعد اردو عالم کو ایک حوالہ جاتی کتاب 'اردو میں افسانچہ کی روایت' دور دور تک پھیل رہی نئی صنف افسانچہ کے لکھنے والوں کے لئے کسی روشنی سے کم نہیں' جہاں افسانچے کے ادبیاسی افسانچہ نگاروں کے لئے اِس صنف کی تہذیب سے روشناس کرانے والا قطب مینار' ہر اُس افسانچہ نگار کو اپنی نجی لائبریری میں محفوظ کر کے گا ہے گا ہے پڑھنا چاہیے تاکہ وہ افسانچہ عالم میں نمایاں ہو سکے۔'' (مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی۔ مئی ۲۰۱۱ء) ☆☆☆

دیپک بدکی

ڈاکٹر عظیم راہی اردو افسانچہ نگاری کا ایک اہم نام ہیں۔ اردو ادب میں انھوں نے ہمیشہ نثر کو نظم پر ترجیح دی۔ گو انھوں نے افسانہ نگاری بھی کی اور تین افسانوں کے مجموعے شائع کیے مگر ان کا طبعی میلان افسانچہ نگاری کی جانب رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ ہندوستان کے ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے افسانچے کو اردو ادب میں اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے انتھک کوشش کی اور اس میں سرخرو بھی ہوئے۔ ان کی تحریر شدہ کتابوں کی فہرست سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جہاں اردو ادب کو تین بیش بہا افسانچوں کے مجموعے عنایت کیے، وہیں افسانچوں کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے بھی چار کتابیں قلم بند کی ہیں۔ ان تصانیف میں انھوں نے نہ صرف افسانچہ نگاری کی مبادیات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کی ارتقائی منزلوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جن اردو رسالوں نے صنفِ افسانچہ کی حمایت کی اور اس کے لیے خصوصی شمارے و گوشے وقف کیے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سارے افسانچہ نگاروں کے فکر و فن پر مضامین لکھے ہیں یا پھر ان کے افسانچوں کے مجموعوں پر تبصرے رقم کیے ہیں۔''
(مضمون: ڈاکٹر عظیم راہی کا تخلیقی و تنقیدی شعور)

☆☆☆

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

''اردو افسانچے کی روایت کی تخلیق و ترتیب راہی صاحب کا بڑا کام ہے میں تو کہوں گا افسانچے کی صنف پر ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ پہلی بار انھوں نے افسانچے کا تنقیدی مطالعہ جاری فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے اس کے اچھے اور کمزور دونوں پہلوؤں پہ بحث کی ہے افسانچے کے ساتھ زیادتیوں کو لے کر آپ کا جذباتی ہونا بھی قدرتی بات ہے کیونکہ وہ خود افسانچہ نگار ہیں اور افسانچے کی صنف سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کی عمر دراز کرے تاکہ وہ اسی طرح اردو ادب' خاص کر افسانچہ کی صنف کی خدمت کے لیے سرگرداں رہیں آمین۔'' (تصنیف: 'ہم قلم' سے ماخوذ)

☆☆☆

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

''عظیم راہی نے افسانچہ نگاری کے دوطرفہ فروغ میں تعاون دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف عمدہ افسانچہ نگاری

AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.
ISSN 2320-6519

کی ہے بلکہ انھوں نے افسانچہ نگاری کی تنقیدی روایت کو بھی بنیاد فراہم کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ انھوں نے 'اردو میں افسانچہ کی روایت تنقیدی مطالعہ' کتاب لکھ کر افسانچہ نگاری کی تنقید میں میل کا پتھر ثبت کیا ہے۔ اُن کی یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آئی ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد افسانچہ نگاری کی مقبولیت روز افزوں فروغ حاصل ہوا ہے۔ افسانچہ لکھنے، افسانچہ پر تنقید اور افسانچہ کے فروغ کے لئے عملی کاوشوں کو ایک نئی سمت ملی ہے۔ عظیم راہی کا ایک افسانچہ ملاحظہ ہو :

چلن

''وہ شخص جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی۔
معجزاتی طور پر میرے بچ جانے پر _____
مبارکباد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا۔''

عظیم راہی نے 'چلن' میں سماج کے منافقانہ رویہ کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ افسانچہ سفید کالر اور سیاہ دل لوگوں ڈھونگی' مذہبی رہنماؤں دوغلی شخصیت کے مالک افراد پر کاری ضرب ہے۔ آج زمانہ اِس طرح کا ہوگیا ہے۔ سیاسی لوگ پہلے کسی کیس میں پھنساتے ہیں اور بعد میں ہمدردی جتانے پہنچ جاتے ہیں۔''

(کتاب: 'افسانچہ اور افسانچہ نگار' سے ماخوذ) ☆

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

''عظیم راہی اردو افسانے اور افسانچہ کا ایک باوقار نام ہے۔ انھوں نے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی وارداتوں اور نفس انسانی کے کئی گوشوں کو آشکار کیا ہے۔ ان کے افسانچے غور و تدبر پر اکساتے ہیں اُن کے افسانچوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کی توجہ برانگیخت کرتے ہیں۔ دراصل عظیم راہی نے افسانچوں پر یہ کتاب لکھ کر اردو افسانچہ سے اپنی دلچسپی کا ٹھوس ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی حسیت کے سبب ان میں فنی برتاؤ کا اچھا شعور پیدا ہوا ہے۔ مثلاً ان کا ایک افسانچہ 'دوسری شادی' پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے :

ارے بھائی سنا تم نے، اُس نے پچاس برس کی عمر میں اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔
میرے دوست نے بڑی حیرانی سے کہا :
'برائی کیا ہے۔ ہاں اگر وہ دوشادی رچانے کے بجائے صرف عشق لڑاتا اور اِس چکر میں کوئی ناجائز کام ہو جاتا تو گناہِ کبیرہ ہو جاتا' اُس سے تو وہ بچ گیا نہ بھئی۔'

دو بیویاں رکھنا یا دوسری شادی کرنا آج کے مسلم معاشرے میں نہ صرف معیوب بلکہ ایک طرح کا ناجائز فعل سمجھا جاتا ہے۔ یہ محض دین سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ شریعت اسلامیہ میں جہاں ایک مرد کو بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے تو وہیں اُن کے ساتھ صحیح وحق و انصاف کے ساتھ سلوک کی بھی تاکید آئی ہے۔ عظیم راہی نے اپنے افسانچے میں تمام غیر اخلاقی اور بالخصوص جنسی بے راہ روی کا گراف بڑھنے کی وجہ صرف ایک بیوی رکھنے کو قرار دیا ہے۔ دراصل اسلامی قوانین اور نبی ﷺ کا اسوہ حسنہ میں تمام دنیا میں بسنے والے لوگوں کے لئے امن و سلامتی اور خوشحالی کا پیغام موجود ہے۔'' (مجلّہ 'ہماری آواز'، میرٹھ۔ نئی صدی کے دو دہائیوں کا اردو فکشن) ☆

ڈاکٹر نخشب مسعود

''بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کا خطاب بھی اورنگ آباد شہر نے ہی دیا تھا۔ بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی کا قیام بھی اورنگ آباد میں عمل میں آیا اور اب 'بابائے افسانچہ' کا خطاب پانے والے ڈاکٹر عظیم راہی بھی شہر اورنگ آباد کی تیسری بڑی شخصیت ہے۔ 'بابائے افسانچہ' کا خطاب انھیں ہمارے ملک کے مشہور و معروف افسانہ نگار انشاء پرداز' ناول نگار اور ناقد و ڈرامہ آرٹسٹ و ڈرامہ نویس نورالحسنین صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر عظیم راہی اپنے افسانوں' افسانچوں اور افسانچوں کی تحقیق و تنقید کے لئے ایک معروف و مقبول نام ہے۔ جوگندر پال' رتن سنگھ' محمد بشیر مالیر کوٹلوی' عارف خورشید' افسانچے کی آبرو ہیں اُن میں ایک اہم نام ڈاکٹر عظیم راہی کا بھی ہے۔ 'کل اور آج کا غم' اُن کے افسانچوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ ان افسانچوں میں زندگی کی رنگارنگ سچائیاں' تلخیاں' کڑواہٹ اور شیرینی' تخلیقی پرتوں کی تہہ داری میں ہم آمیز ہیں۔ اِس کتاب میں شامل افسانچے جہاں زندگی کے حسین و خوبصورت مشاہدات کا ایک دلکش نظارہ دکھاتے ہیں وہیں وہ سخت و ناخوشگوار تجربات کی دنیا کا پُرحول و خوفناک چہرہ بھی دکھاتے ہیں۔ عظیم راہی کے افسانچے سہل و شستہ و صاف و سلیس زبانوں کا مرقع ہے۔ نہ کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی ادق و ناقابل فہم عبارت آرائی ہے نہ شوکت الفاظ نہ کوئی مسجع و شاعرانہ اسلوب نگارش ہے۔ سیدھے سادھے لفظوں میں اپنی بات کہنے کے ہنرور ہیں۔ علامت و استعارے اور تجدیدیت سے پاک وہ منزہ افسانچوں کا خوبصورت نگارخانہ ہے۔ 'کل اور آج کا غم' کتاب میں شامل افسانچے اکیسویں صدی کے افسانچے ہیں۔ گلوبل ایج اور انٹرنیٹ اور اُس سے آگے کی تکنالوجی کی داستانیں ان افسانچوں کے درمیان نظر آتی ہیں۔ اُن کی دوررس نگاہ آنے والے زمانوں میں بھی جھانک رہی ہے اور اپنے ماضی کے دبیز پردوں میں پوشیدہ داستانوں کو بھی اجاگر کر رہی ہے اِسی بناء پر ہم 'کل اور آج کا غم' کے خالق ڈاکٹر عظیم راہی کو بلامبالغہ اکیسویں صدی کا عظیم فنکار مانتے ہیں۔'' (کل اور آج کا غم' کے رسم اجراء کے موقع پر پڑھی گئی تحریر سے)

☆

AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad. ISSN 2320-6519

تنویر اختر رومانی

''افسانچہ (منی افسانہ) کے سرخیل سعادت حسن منٹو نے 'سیاہ حاشیے' کے ساتھ اس صنف کا جو پودا لگایا تھا وہ نہ صرف شجر تناور ہو چکا ہے بلکہ بارآور بھی خوب ہو رہا ہے۔ اب تو اس درخت پر کئی نمایاں اور رسیلے پھل لگ چکے ہیں۔ کھانگر (جوگندر پال)، مانک موتی (رتن سنگھ)، ڈنک (ایم اے حق)، کورونا کے رنگ (رونق جمال)، گردشِ دوراں (ارشد صدیقی)، کولاژ (اسلم جمشید پوری)، کلائیڈوسکوپ (جاوید نہال چشمی)، مٹھی میں ریت (م ق سلیم)، ایک ایسا بھی دور (نعیمہ جعفری پاشا)، قوسِ قزح (عارفہ خالد شیخ)، لمحے (ڈاکٹر یاسمین اختر)، کانٹوں کا جھنڈ (منظور وقار)، لمحوں کا لباس (اظہر فاضل)، بے ساختہ (جاوید حسین پالوجی شارب)، نظریہ (حنیف قمر)، پاگل پن (حسین قریشی)، شری کھنڈ (پرویز انیس)، برگشتہ ہوا (نخشب مسعود)، دکھتی رگ (خالد بشیر تلگامی)، نشتر (محمد علی صدیقی)، سولفظوں کی سو کہانیاں (ریحان کوثر)، بس اتنا سا افسانہ (سراج فاروقی)، نامعلوم افراد کی معلوم کہانی (ابن عاصی)، کھول دو (تنویر اختر رومانی) اور کل اور آج کا غم نامی ایسے پھل ہیں جن کے رس سے تشنہ زمانہ آسودہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ فہرست میں اور بھی نام ہو سکتے ہیں۔ ان میں ایک بہت ہی نمایاں اور معتبر نام ڈاکٹر عظیم راہی کا بھی ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی افسانچوں کی دنیا میں اس لئے ممتاز ہیں کہ انھوں نے نہ صرف کثیر تعداد میں افسانچے لکھے بلکہ وہ افسانچوں اور فن افسانچہ کے پہلے ناقد بھی ہیں۔ افسانچوں کی حمایت میں انہوں نے 'اردو میں افسانچے کی روایت: تنقیدی مطالعہ' (۲۰۰۸ء) اور 'اردو افسانچہ کی مقبولیت اور پیش رفت: ایک مطالعہ (۲۰۱۵ء) لکھ کر ادبی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ ہر دو لاثانی کتاب ہیں، جن میں عظیم راہی نے افسانچے کے اوصاف، اس کے فن اور فنی لوازمات، اس کی شعریات، تخلیقیت نیز اس کے ارتقا، ادب میں اس کی اہمیت وضرورت، فکشن میں اس کے امتیازات پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔ موصوف اگر افسانچے نہ لکھتے تب بھی انھیں یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لئے یہ کتابیں کافی ہیں۔ یوں تو عظیم راہی نے افسانے بھی لکھے، تنقیدی مضامین بھی لکھے لیکن ادب میں ان کی شناخت ایک معتبر افسانچہ نگار کے طور پر معروف ہے۔ افسانچے کے میدان میں ان کی شہرت بلندی پر ہے۔ طویل مدت سے وہ صنف افسانچہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ان کے افسانچوں کے تین مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں: (۱) پھول کے آنسو (۱۹۸۶ء)، (۲) درد کے درمیان (۲۰۰۲ء)، (۳) کل اور آج کا غم (۲۰۲۰ء)''

(ماخوذ: راہِ افسانچہ کا معتبر راہی: عظیم راہی)

☆☆☆

بقیہ : اکیسویں صدی میں' اردو افسانچہ کی صورتحال کا جائزہ

وہ بھی اس کی مقبولیت سے متاثر ہوئے ہیں۔ افسانچہ کی قبولیت کے وقار کو برقرار رکھنا بھی لازمی امر ہے جو آج کل ایک بڑا مشکل کام ہے کہ افسانچے کی صنفی سطح پر مستحکم ہونے کی راہ میں کئی رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں، اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ہراساں' اکثر پر خود ساختہ موجد بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اس چکر میں عبدالعزیز خاں افسانچے کے نام پر ایک عرصے سے یک سطری کہانی لکھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اچھی بات ہے کل مزید ترقی یافتہ دور میں لوگ ''یک لفظی'' کہانی لکھنے کا جواز پیدا کر لیں گے۔ یک سطری کے ساتھ منی افسانہ منی کہانی کے دم چھلے بھی افسانچے کے ساتھ اس کے لکھنے والوں نے لگا رکھے ہیں حالانکہ جوگندر پال نے افسانچے کا نام بہت پہلے ہی دے رکھا ہے۔ (۱۹۶۲ء میں ان کے افسانوی مجموعہ ''میں کیوں سوچوں'' میں ۳۲/ افسانچے اسی نام سے شامل ہیں۔ سب سے پہلے افسانچہ کا نام جوگندر پال نے ہی استعمال کیا ہے) ادھر مقصود الٰہی شیخ پاپ کہانی کے نام سے افسانچہ کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنانے پر تلے ہیں اور افسانچہ کو بدنام کرنے کا پاپ بھی ادب میں کر رہے ہیں تو ابھی ابھی مناظر عاشق ہرگانوی نے کٹ اپ تکنیک افسانچے لکھنے کی شروعات کر کے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا ہے اور اسے محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے بجا طور پر افسانچہ پر ''تیسرا حملہ'' قرار دیا ہے۔ افسانچے پر اس طرح کے حملوں کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ چند لوگ 'آتش پارے' کے نام سے افسانچے لکھ رہے ہیں تو فاروق راہب نے 'راک کہانی' کا آغاز کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کل ان کا دیکھا دیکھی کوئی 'کنٹوپ کہانی' لکھنا شروع کر دے۔ ادب میں آخر اس لایعنی سلسلہ کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

تسلیم شدہ اس مقبول عام صنف کو نئے نئے نام دے کر منزل کی سمت گامزن راستوں پر مزید پیچیدگی پیدا کر کے، محض اپنا نام زیادہ نمایاں کرنے کی کوششوں سے بھلا کیا حاصل ہوگا؟ یہ سمجھ سے باہر ہے۔ ان تخلیق کاروں کے ساتھ' ادھر تجربہ پسند مدیر الگ ان چیزوں کو سراہتے ہوئے اس سلسلہ کو مزید ہوا دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ادب میں تجربے لازمی ہیں جو زندگی سے عبارت ہوتے ہیں لیکن جب افسانچہ کا تجربہ اپنی اہمیت کو منوا کر صنفی شکل میں کامیاب ہو چکا ہے تو پھر اسے مزید نئے تجربوں سے گذارنا یقیناً اس کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنا کر اس پر شب خون مارنے کے ہی مترادف ہے۔ اس سارے منظر نامے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ افسانچہ تو بے حد مقبول ہو رہا ہے اور زیر بحث بھی ہے لیکن یہ اعداد وشمار افسانچے کی مقبولیت وقبولیت کے ساتھ اس کی بدنامی اور معتوب ہونے کا جواز بن کر بھی ابھر رہے ہیں جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور بطور خاص نئے لکھنے والوں کے لیے تو لمحہ فکر ہے کہ اکیسویں صدی میں اپنی اس پنپتی صنف کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ' اس کی صنفی ساکھ کو بچانے کی بھی شدید ضرورت ہے۔

تبصرے

عظیم راہی کے افسانچوں کی کتاب (۱) 'پھول کے آنسو'

(یہ مضمون یکم ستمبر ۱۹۸۷ء کو لکھا گیا تھا)

نذیر فتح پوری

عظیم راہی کے افسانچوں کی پہلی کتاب 'پھول کے آنسو' پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس نوجوان ادیب میں تخلیقی صلاحیتوں کا فقدان نہیں ہے اور یہ مصور لفظوں کی تصویر بنانے میں بھی مشاق و ماہر ہے لیکن موجودہ ادبی افراتفری کے عالم میں عظیم راہی نے اپنے قلم کا رخ جن سمتوں کی جانب موڑا ہے ان راہوں پر پھول کم اور آنسو زیادہ ہیں کیونکہ آزاد غزل کی طرح افسانچہ بھی تجربات کی قربان گاہ پر زندگی اور موت کی کشمکش میں ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ (یہ ۲۵ سال پہلے کی صورتحال تھی)

ادب میں تجربات اور مشاہدات کی زبانی حمایت کرنے والوں اور لفظی ڈھول پیٹنے والوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں لیکن افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ادب کا جیالا سپاہی مجتہد بن کر میدانِ عمل میں اترتا ہے تو یہی حمایتی کیل کانٹے سے لیس ہوکر دشمن کی فوج کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اسے گھیر کر مارنے کے لیے اپنی تمام طاقت داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ایسے حملوں سے ادب کا کتنا بھلا ہوتا ہوگا یہ تو وہی لوگ جانیں لیکن نئی سمتوں کے متلاشی فنکار اس حملے سے دلبرداشتہ ہوکر یا تو اپنا راستہ بدل دیتے ہیں یا الٹے قدموں لوٹ جاتے ہیں اور یوں ایک تجرباتی ادبی تحریک وقت سے پہلے دم توڑ دیتی ہے۔ افسانچے کی عمر یوں بھی کچھ زیادہ نہیں ہے اسی لیے اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی بھی قابل رشک و ستائش نہیں ہے۔ نامور ادیبوں اور معتبر افسانہ نگاروں نے افسانچے کو اب بھی اچھوت سمجھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن کے دروازے افسانچے کے لیے وا نہیں کیے ہیں۔ اگر ہم منٹو کے افسانچوں پر لطیفوں کا لیبل چسپاں کرتے ہیں تو پھر جوگندر پال کو افسانچوں کا موجد تسلیم کر لینا چاہیے۔ جوگندر پال اردو افسانے کی آبرو ہیں۔ جوگندر پال نے افسانوی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ افسانچہ نگاری کے میدان میں بھی ان کی خدمات کم نہیں۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے عظیم راہی جیسے تازہ دم اور تازہ ذہن قلمکاروں کی سخت ضرورت ہے۔ زیر مطالعہ کتاب 'پھول کے آنسو' اس ضرورت کو پورا تو نہیں کر سکتی لیکن اس داستان میں ایک قابل قدر باب کا اضافہ کر سکتی ہے۔ میں یہاں عظیم راہی کے افسانچوں کی شرح بیان نہیں کروں گا بلکہ اتنا ہی عرض کروں گا کہ عظیم راہی کے افسانچے زندگی سے اپنی قربت کا احساس دلاتے ہیں اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کا خالق موجودہ سماج ہی کا ایک فرد ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح زندگی کے مسائل کو دیکھتا ہے اور ایک فنکار کی طرح اسے افسانچہ بنا کر پیش کرتا ہے، وہ حساس دل اور بیدار دماغ کا مالک ہے۔ کھلی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہے اسے قلمبند کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ وہ اپنے محسوسات کو کاغذ پر لکھتے وقت کسی قسم کے خوف کا شکار نہیں ہوتا، نہ ہی کسی طرح کی جھجک کو اپنے قریب آنے دیتا ہے۔

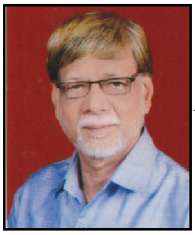

زندگی کے المیہ اور طربیہ دونوں پہلوؤں پر اس کی نظر ہے۔ جس کا برملا اظہار وہ اپنے افسانچوں میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''لوگو! دیکھو یہ تمہارے ہی زخم ہیں جنھیں میں نے اپنے قلم سے افسانچوں کے قالب میں ڈھالنے کی جسارت کی ہے اور آج ان افسانچوں کو چھاپ کر کتاب کی صورت میں تم لوگوں کو اعزازی تقسیم کر رہا ہوں۔ تم نے اگر میری کتاب میں چھپے اور چھپے پھول کے ان آنسوؤں کو شرف قبولیت عطا کر دیا تو میں سمجھوں گا میری محنت اور قربانی رائیگاں نہیں گئی۔''

☆☆☆

اقتباس : ڈاکٹر محسن جلگانوی

''مصنف نے افسانچہ نگاری کی مقبولیت کا جواز یوں پیش کیا ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے اردو ادب کا قاری بڑے ناول اور طویل افسانے پڑھنے کا عادی تھا لیکن صنعتی گہما گہمی اور میڈیا کی یلغار کی وجہ سے لفظ کی قدر و قیمت گھٹ گئی ہے اور غور و فکر پر قدغن سی لگ گئی ہے' اسی لیے عصر حاضر کے تخلیق کاروں نے قصہ' کہانی' پلاٹ اور کرداروں کی تفصیل کے بجائے کم لفظوں میں موثر طریقہ سے کسی خیال یا واقعہ کو پیش کرنے کے لیے افسانچے کا سہارا لیا۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں تیز رفتاری کے ساتھ اختصار پسندی کا رجحان بھی عام ہے۔ فکشن میں پہلے مختصر افسانہ اور اب منی افسانہ (افسانچہ) بھی آج کے عہد کی تیز رفتاری اور اختصار پسندی کی عطا ہے۔'' (مطبوعہ 'اوراق ادب' روزنامہ 'اعتماد' حیدرآباد۔ ۷ر دسمبر ۲۰۰۹ء) ☆

ISSN 2320-6519

تصنیف ''افسانچہ کی روایت'' (تحقیق وتنقید)

مصنف : ڈاکٹرعظیم راہی

مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹرعظیم راہی افسانہ نویس اور افسانچہ نگار ہیں۔خصوصیت سے افسانچہ نگاری میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔اردو میں یہ صنف بیحد مقبول ہوچکی ہے۔ وجہ اس کا اختصار ہے۔کم الفاظ میں استدلال اور معانی تک پہنچنے کی تخلیقی چبھن ہے۔عظیم راہی نے اس صنف کے جواز پرخصوصی توجہ دی ہے اور پہلی تنقیدی کتاب لکھ کر اعتبار بخشا ہے۔ شناخت کی بھرپور پیش قدمی کی ہے اور متجسس بصیرت عطا کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ایک روشن رہگذر سے ذہن منور ضرور ہوتا ہے اور افسانچہ کی تحریک ملتی ہے۔اس میں چھ ابواب ہیں (۱) افسانچہ کی ابتداء اور ارتقاء (۲) افسانچہ کی تعریف و دیگر فنی لوازمات (۳) مہاراشٹر میں افسانچہ کی مقبولیت اور صورتحال (۴) ملک کی دیگر ریاستوں میں افسانچہ کی صورتحال (۵) برصغیر' مشرق و مغربی ممالک میں افسانچہ کی صورتحال کا جائزہ اور (۶) مجموعی تاثر۔ ڈاکٹرعظیم راہی نے تحقیقی وتنقیدی مطالعہ و مکاشفہ پیش کر کے تخلیقی حیثیت اور بصیرت سے بھرپور اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب دی ہے،وہ لکھتے ہیں: ''اردو میں منٹو نے سب سے پہلے 'سیاہ حاشیے' کے عنوان سے مختصر ترین افسانے لکھ کر اس صنف کی بنیاد ڈالی۔ان کے بعد جوگندر پال جیسے ہمہ جہت فنکار نے اسے اعتبار و وقار بخشا ہے۔''

افسانچے کی تعریف کے ضمن میں عظیم راہی کی یہ رائے توجہ طلب ہے :

''منی افسانہ تخلیق کار سے فنی پختگی کہنہ مشقی کے ساتھ ہی اختتام پر قاری کا چونکنا اور متاثر ہونا نہایت لازمی ہوتا ہے ورنہ منی افسانہ، افسانچہ کے لطیفہ پن میں تبدیل ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔''

افسانچے کا فن سرعت تاثیر اور اختصار و اظہار کا متقاضی ہوتا ہے۔اُس کا فن مشاقی کا ہنر چاہتا ہے کہ تاثیر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کثرت کو وحدتِ تاثر میں بدلنے کا عمل لازمی ہوتا ہے۔(مطبوعہ: سہ ماہی 'توازن' مالیگاؤں' سلسلہ نمبر ۴۷۔ جنوری تا اپریل ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

کل اور آج کا غم

(افسانچوں کا مجموعہ)

مصنف : ڈاکٹرعظیم راہی

تبصرہ نگار : عارفہ خالد شیخ (ممبئی) 8452875777

مایۂ ناز ادیب اور فکشن نگار ڈاکٹر عظیم راہی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی اب تک کئی تصانیف منظر عام پر جلوہ گر ہو کر داد حاصل کر چکی ہیں۔''کل اور آج کا غم'' افسانچوں پر مبنی اُن کی تیسری کتاب ہے۔ مجھے انھیں پڑھنے کا شرف پہلی مرتبہ حاصل ہوا اور یہ کہتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ موصوف ایک اچھے ادیب و قلم کار ہی نہیں ایک جہاں دیدہ انسان بھی ہیں۔کتاب میں درج افسانچوں میں انھوں نے انسانی فطرت کے ہر اُس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو زندگی کے انجان موڑ پر مختلف کرداروں کے روپ میں ہمیں ملتے ہیں۔ ہم ان احساسات کو جیتے ہیں، جھیلتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور ان سے جوجھتے بھی ہیں۔بعض اوقات یہ احساسات ہماری زندگی کی کایا ہی پلٹ دیتے ہیں۔

۱۷۵ افسانچوں کا یہ مجموعہ خواہشات اور ذمہ داری کے احساسات سے لے کر خوشی غمی ، چالاکی چالبازی ، دھوکہ چاپلوسی ،خوشامد عداوت ،نفرت اور محبت جیسے بے شمار رنگوں کا امتزاج نظر آیا' جو انسانی فطرت کے غماز ہوتے ہیں۔موصوف نے اپنی اس تخلیق کا نام بھی خوب رکھا ہے 'کل اور آج کا غم'۔اکثر زندگی کی داستان اِن ہی الفاظ کے اساطیری سحر میں گرفتار نظر آتی ہے۔

افسانچوں کی اس طویل قطار میں کہیں گہرا طنز جھلکتا رہا تو کہیں تاسف اور افسردگی دکھائی دی۔کہیں دوستی کی آڑ میں دشمنی نظر آئی تو کہیں ایماندار اور محنتی اشخاص کو سماج کے ٹھیکے داروں کے ہاتھوں رسوا کئے جانے کا المیہ دکھائی دیا۔کسی افسانچے میں اولاد کی خوشیوں پر اپنی زندگی تج دینے والے والد کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پچھتاتے دیکھا' تو کسی میں لوگوں کو ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرتے دیکھا۔غرض ہر افسانچے کی بنت ایسی صاف دکھائی دی کہ اختتام پر قاری کو زندگی کے نشیب وفراز اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آئے۔

یہ افسانچے اگرچہ الگ الگ نوعیت کے رہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ان میں مماثلت نظر آئی۔دو ایک موضوع بھی دہرائے گئے۔ جیسے : خدشہ ، دائرہ اور اپنا دائرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی نظر آئی کہ موصوف نے اپنے اس مجموعے میں ایک ہی موضوع اور عنوان پر تین سے چار افسانچے قلمبند کیے' جو اس کی وسیع النظری اور خیالات کی عمیق گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔

کچھ افسانچے چند جملوں پر محیط رہیں تو کچھ افسانچے پیراگرافوں کی صورت نظر آئے۔ چونکہ اب تک

AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.
ISSN 2320-6519

افسانچوں کی حد بندی کا پیمانہ رائج نہیں ہوا' اس لئے انھیں خوشی سے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ افسانچے دراصل منی کہانیاں ہوتے ہیں اس لیے ان میں کہانی پن ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کا ذکر اور اعتراف قابل افسانچہ نگار کر چکے ہیں اور یہ بات زیرِنظر افسانچوں پر صادق بھی آتی ہے۔ انھوں نے بغیر لاگ لپیٹ کے بڑے ہی آسان اور سیدھے سادے طریقے سے اپنی بات قاری کے سامنے پیش کردی۔

ایک سماجی زندگی میں درآید پیچیدگیوں و باریکیوں کو اجاگر کرنے کے لئے راقم نے ہر اُس موضوع کا سہارا لیا جسے ہم زندگی کا سفرنامہ کہہ سکتے ہیں۔ ان موضوعات میں عورت بھی ہے، دھوکہ بھی ہے، مرد بھی ہے، مجبوری بھی ہے، دنیاداری بھی ہے اور سیاست بھی۔ اور تو اور کل اور آج کا غم بھی ہے۔ غرض کن کن باتوں کا ذکر کریں۔ ہر کہانی میں زندگی کا ایک فلسفہ چھپا ہے۔ پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوا گویا تخلیق کار نے اپنی زندگی کے سارے رس تجربات کی بھٹی میں پختہ کر کے ایک ٹھوس حقیقت کے روپ میں سرزمین ادب پر بکھیر دیئے۔ قابل افسانچہ نگار نے اپنے ان افسانچوں میں سیاسی' سماجی' معاشی اور معاشرتی واقعات وحالات کا تذکرہ اس سادگی سے کیا ہے کہ یہ ہر انسان کی اپنی کہانی نظر آتی ہے۔ پھر چاہے وہ 'سرشت' ہو یا 'معلق زندگی'، 'خودغرض مسیحا' ہو یا 'انسان'۔ عام زندگی میں ایسے کئی کردار ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک رہتے ہیں۔ جن سے ہمارا روز کا آمنا سامنا ہوتا ہے لیکن یا تو ہم انھیں برداشت کرتے ہیں یا فراموش کردیتے ہیں' لیکن ایک ادیب جو کہ سماج کا علمبردار ہوتا ہے' وہ زندگی کی 'کڑوی سچائی' کو تاریکی و گمنامی کے اندھیروں سے نکال کر اپنی نوک پلک سنوار کر اُسے حیاتِ جاودانی عطا کرتا ہے۔ یہ بات موصوف پر صادق آتی ہے۔

کتاب میں درج افسانچوں میں مکافاتِ عمل کی تپش بھی ہے اور پچھتاوا بھی۔ کسی میں درس وعمل کی ترغیب تو کسی میں ذمہ داریوں کا احساس جگاتے دلائل بھی شامل رہے۔ ان میں 'شہرت' مجھے پسند آیا۔ کچھ لوگ اچھی شہرت اپنے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور برائی کی تشہیر کر کے دوسروں کو گندی شہرت دلاتے ہیں۔ افسانچہ 'کمال' میں یہ کمال نظر آیا کہ راوی اپنے مرد ہونے کو کمال سے تشبیہ دے رہا ہے۔ کہیں کہیں افسانچے میں ایک جیسے جذبات نظر آئے۔ جیسے افسانچے 'اثر' اور 'انتہا' دونوں میں ایک جیسے کردار رہے۔ دونوں کردار ناانصافی پر آواز اٹھاتے ہیں۔ 'اثر' کا اثر یہ ہوا کہ کردار بے حس ہوگیا اور 'انتہا' کا انجام یہ ہوا کہ کردار کو ظالم سماج نے پاگل قرار دے دیا۔ اسی طرح 'انکشاف'، 'معاشرت'، 'دوست/دشمن'، 'اپنا خون' وغیرہ میں بھی ایک جیسا خیال ونظریہ دکھائی دیا۔ 'وقت' ایک استعاراتی افسانچہ نظر آیا۔ موصوف نے کتوں' بلیوں اور چوہوں کا حوالہ دے کر یہ جتلانے کی کوشش کی کہ واقعی وقت بدل گیا۔ 'تصویر کا دوسرا رخ' اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے اسی لئے اکثر انسانوں کو انگلیوں سے تشبیہ دے کر یہ کہا جاتا ہے کہ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ 'دوراندیش' یہ افسانچہ دیکھتے ہی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ ضرور اس میں نانا جان اور دادا جان کی دوراندیشی تحریر ہوگی۔ لیکن چند جملوں پر مبنی افسانچہ پڑھ کر افسانچہ نگار کی دوراندیشی نظر آئی جو دوستی کو رشتے داری کے چنگل سے بچانے کی سعی تھی۔ اسی طرح 'سب سے بڑا سکھ' اولاد کا سکھ ظاہر کرتا ہے تو 'فرق'، 'ناخلف' اولادوں کی کمتری بتلاتا ہے۔ 'انسانی دائرہ' انسانی بے حسی اور خودغرضی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان افسانچوں میں 'بے مصرف چینل'، 'گلوبل معاشرہ'، 'گلوبل وعدے' جیسے افسانچے حالاتِ حاضرہ پر مشتمل ہیں۔

کچھ افسانچے روحانیت لئے ہوئے بھی نظر آئے۔ جیسے 'بے روح'، 'ہماری دین داری'، 'قدر و قیمت' وغیرہ یہ طنزیہ افسانچے محسوس ہوئے جو نام نہاد دینداروں پر کاری ضربیں تھیں۔ کچھ حدیثوں پر مبنی افسانچے بھی اس گلدستے میں پھولوں کی طرح مہکتے رہے۔ جیسے کہ 'دھوکہ' جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ ''مومن ایک سوراخ سے دو بار ڈسا نہیں جاتا۔'' اور 'علامت' جس میں ایک حدیث منقول ہے کہ ''ایک مومن کو اگر کانٹا بھی چبھ جائے تو دوسرا مومن بھائی اس کی چبھن کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ایمان کی علامت ہے۔''

'طفل مکتب'، 'معتوب' اور 'حق گو' بہت پسند آئے کیونکہ ناچیز ایک ناقد وتبصرہ نگار بھی ہے۔ چونکہ افسانچے افسانوں کی ذیلی شاخیں ہیں اس لئے اگر اس میں بھی افسانوی رنگ شامل کرلیا جائے تو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔ تخیل کی معراج سے چنے گئے ستاروں سے افسانچوں کی مانگ میں افشاں بھر دی جائے تو قاری کو خوشی و انبساط کے ساتھ طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور دورانِ مطالعہ وہ خوشگوار احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ میرا ایسا ماننا ہے کہ ادباء وہ فنکار ہوتے ہیں جو ادب کو دلہن کی طرح سجانے سنوارنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ افسانچوں کی اس صنف کی ترقی وترویج کے ساتھ اس کی بقاء کے لیے گر انھیں خوبصورتی سے آراستہ وپیراستہ کریں تو اس میں ایک نیا رنگ پیدا ہوگا اور اس کے ارتقاء کا پایہ بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔

سلیس زبان سے مزین ڈاکٹر عظیم راہی صاحب کی یہ کتاب فنی اعتبار سے آسان اور عام فہم ہے۔ دورانِ مطالعہ بوریت واکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ قاری تواتر سے پڑھتے ہوئے ایک ہی نشست میں کتاب تمام کرلیتا ہے۔ آخر میں بس اتنا ہی کہ اللہ ان کے قلم کو جلا بخشے اور ہمیں ایسے کہنہ مشق ادباء کی تصانیف پڑھ کر ان سے سیکھنے کے مواقع ملتے رہیں۔ آمین ☆☆

AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.
ISSN 2320-6519

کتاب کا نام: درد کے درمیاں
مصنف : عظیم راہی

مبصر : سلیم انصاری (جبلپور)

اردو میں مختصر ترین/منی افسانوں کی روایت زیادہ قدیم نہیں اور اس صنف ادب کی آبیاری کرنے والے تخلیق کاروں کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ تاہم یہ امر خوش آئند ہے کہ منی افسانوں کو تخلیق کرنے والے فنکاروں میں جوگیندر پال اور رتن سنگھ کے نام اہم ہیں اور اب عظیم راہی کے منی افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اس صنف ادب کو اپنی تخلیقی سوچ کے ارتکاز سے نئی سمت و معنی دینے میں مصروف ہیں۔ ان کے منی افسانوں کا تازہ مجموعہ 'درد کے درمیاں' ہے۔ اس سے قبل ان کی کتاب 'پھول کے آنسو' ناقدین شعر و ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب رہی تھی۔

میرے نزدیک اچھے تخلیق کار کا اچھا انسان ہونا ضروری ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس وقت ملی جب ممبئی میں اُن سے ملاقات کا موقع ملا۔ عظیم راہی ایک عمدہ انسان ہیں اور حساس بھی اتنے کہ اپنی کتاب کا نام ہی 'درد کے درمیاں' رکھا۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے نورالحسنین نے لکھا ہے :

''میں عظیم راہی کا شمار ان فنکاروں میں کرتا ہوں جن کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ وہ معاشرے کے نکڑ سے کبھی آنکھ بند کر کے گزرنے کے قائل نہیں ہیں۔''

میرے نزدیک عظیم راہی انسانی ہمدردیوں کے تخلیق کار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں 'درد کے درمیاں' ایک لذت آگیں' تخلیقی سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم بھی انہی کہانیوں سے روز و شب گزر رہے ہیں اور نہ صرف گزر رہے ہیں بلکہ انہی کہانیوں کا حصہ ہیں۔

عظیم راہی کے منی افسانوں پر کوئی حتمی رائے دینے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ انٹرنیٹ اور سائبر عہد میں جہاں ایک طرف رشتوں کا زیاں ہوا ہے' انسانوں کے درمیان لاتعلقی کی ایک خلیج قائم ہوگئی ہے۔ ادب سے بیزاری کا رجحان بڑھا ہے وہیں انسان کے بنیادی مسائل وہی ہیں جو اَب سے پچاس برس پہلے یا ایک صدی قبل تھے۔ عظیم راہی نے جھوٹ، مکر و فریب، ریا، بے رشتگی اور انسان کی بے مہرگی کو اپنی بصیرت کے حوالے سے نیا ویژن (vision) عطا کیا ہے۔ مثلاً ایک چھوٹی سی کہانی ملاحظہ فرمائیں : 'پہچان' (صفحہ ۶۰)

''تمہارے دوست نے تمھیں دھوکہ دیا۔ تمہارے ساتھ فریب کیا اور اس بات کا تمھیں کوئی دکھ بھی نہیں۔''

''دکھ کیسا بھائی، مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں میرے سارے دشمن وفادار اور دوست ریاکار ہیں .....''

منی افسانہ 'چلن' (صفحہ ۲۰) میں بھی یہی احساس کارفرما ہے :

''وہ شخص جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی۔ معجزاتی طور پر، میرے بچ جانے پر ..... مبارکباد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا .....''

یا پھر 'خودغرض' (صفحہ ۷۱) میں :

''وقت نکل جانے پر ..... اکثر لوگ اپنے محسن کو ہی بھول جاتے ہیں۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ .....

محسن کو بھول جانے والی بات ہمیشہ یاد رہتی ہے .....''

اس کے علاوہ 'رفاقتیں' (صفحہ ۱۰۴) میں :

''جب تک تم مجھ سے دور تھے تو اس دوری میں بھی قربت تھی۔ لیکن جب تم میرے قریب آئے تو تم سے جدا ہونے کا تصور بھی محال محسوس ہوا۔

لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جانے کیوں ایسا لگا کہ تم قریب آکر مجھ سے جیسے بچھڑ گئے ہو اور مجھ سے نزدیک ہوکر بھی واقعی میرے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگئے ہو .....''

عظیم راہی کی کتاب 'درد کے درمیاں' کے مندرجہ بالا اقتباسوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے موجودہ عہد کی سفاکیوں، بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کے کرب اور

زوال پذیر تہذیبی قدروں سے اپنی کہانیوں کے موضوع لیے ہیں اور یہ غیر فطری بھی نہیں۔ کیونکہ بہرحال تخلیق کار بھی سماج کی حساس اکائی ہوتا ہے اور معاشرے میں تہذیبی اور ثقافتی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ہمارے موضوعات ان کے یہاں تخلیقی بصیرتوں کے حوالے سے روشن ہوتے ہیں۔ (ص ۸۸)

عظیم راہی کی کہانیوں کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے اور ان کی کہانیوں کی مختلف جہتوں پر گفتگو اس مختصر سے مضمون میں ناممکن ہے۔ تاہم ان کے منی افسانوں کے حوالے سے یہ بات نہایت وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں ایک طرح کی spontaneity ہے۔ ایک تخلیقی آگ ہے جو ذہنوں کو روشن کردیتی ہے اور قاری کو دیر تک اپنے اندر گم رکھتی ہے۔ چونکہ منی افسانوں سے عموماً کردار غائب ہوتے ہیں لہٰذا قاری خود ایک کردار کی طرح کہانی میں سانسیں لیتا ہے اور کہانی کے نشیب و فراز سے گذرتا ہوا ایک وسیع تر معنوی سطح پر پھیل جاتا ہے۔ عظیم راہی کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ احساس کی شدت ہے۔ اظہار کی بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ اسلوب کا اچھوتا پن ہے اور یہ تمام ایسی خوبیاں ہیں جو کسی تخلیق کار کو نئے تخلیقی موسموں اور منظروں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ عظیم راہی 'درد کے درمیاں' کے منی افسانوں کو برتنے میں اس اعتبار سے کامیاب ٹھہرے ہیں کہ ان کے یہاں کہنے کو بہت کچھ ہے اور کہنے کے لیے اظہار کی سلیقہ مندی بھی ہے۔

عظیم راہی نوجوان تخلیق کار ہیں اور ان کا تخلیقی سفر مسلسل جاری ہے لہٰذا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ 'درد کے درمیاں' ان کی منزلیں نہیں بلکہ ایک عارضی پڑاؤ ہے۔ آگے طویل تخلیقی سفر کے نشانات روشن ہیں۔ جہاں سے ان کو نئی سمتوں کو جانا ہے۔

(اسباق۔ پونہ۔ مطبوعہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۴ء)

ISSN 2320-6519 AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.

مضامین (ڈاکٹر عظیم راہی)

اکیسویں صدی میں، اردو افسانچہ کی صورتحال کا جائزہ

اردو میں افسانچہ کی روایت مستحکم رہی ہے جو اپنی ابتداء سے لے کر آج تک ارتقائی سفر کے ساتھ مسلسل جاری وساری اور مبسوط و مربوط ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے ایک بار پھر اسے لکھنے والوں نے سہل سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ افسانچہ کا فن مشکل اور دقت طلب ہے جو کڑی محنت اور مسلسل ریاضت چاہتا ہے۔ یہ گہرے مطالعے کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ جو افسانہ لکھ سکتا ہے وہی افسانچہ لکھ سکتا ہے۔ افسانہ اچھا یا برا ہے اس کا فیصلہ لکھنے والے کے حق میں وقت طئے کرے گا وہ ادب میں بہرحال اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سبب ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ وقت سب سے بڑا ناقد بھی ہے۔ یہ فیصلہ ہم وقت پر چھوڑتے ہیں لیکن یہ بات طئے ہے کہ افسانہ نگار ہی افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ کے ساتھ اچھا افسانچہ وہی لکھ سکتا ہے جو اس کے فنی لوازمات پر پوری دسترس رکھتا ہے۔ اس بات سے محمد بشیر مالیرکوٹلوی بھی اتفاق کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

''افسانچہ وہی ادیب تخلیق کرسکتا ہے جو افسانے کے رموز سے اچھی طرح واقف ہو۔ عصری تقاضوں کو سمجھ سکتا ہو اور اپنے دور کے قاری کے مزاج کو بھی سمجھتا ہو۔'' (افسانچے کی تعریف اور کامیاب افسانچے کی خوبیاں۔ مطبوعہ ایوان اردو مئی ۲۰۱۳ء ص ۱۴)

وہ افسانچہ نگار جو صرف اسی صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے اپنی ناواقفیت، اپنی ناتجربہ کاری کے سبب اپنے افسانچہ کو محض اخبار کی خبر کا حصہ بنا دیتا ہے یا کبھی کسی قول کی نقل کو افسانچہ سمجھ بیٹھتا ہے یا اسے لطیفہ سے قریب کرکے اس کی صنفی حیثیت کو ہی مشکوک بنا دیتا ہے۔ بقول سلیم شہزاد :

''لطیفہ صوفیاء کے لطائف کی لطافت سے تعلق رکھنے کے باوجود/ باوصف فنی اور ادبی مظہر نہیں، اس لیے افسانچہ کو لطیفہ بننے سے بہرحال بچایا جانا چاہیے کہ افسانچہ ادب کی صنف سے ہم رشتہ ہونے کے سبب اپنے آپ میں ایک صنفی مظہر ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔''

(بیانیے کے تاثر کی تصویر، عارف خورشید نمبر، ص ۲۰۲ عالمگیر ادب، کتابی سلسلہ)

اس صورتحال کا ایک منظر سینئر افسانہ نگار سلام بن رزاق کے لفظوں میں دیکھئے۔

''آج کل جو لوگ افسانچے لکھ رہے ہیں اس میں بیشتر سہل پسندی کا شکار ہیں۔ اکثر افسانچہ نگار کسی لطیفے قول یا فقرے کو افسانچہ بنا دیتے ہیں جس میں نہ کوئی فنکاری ہوتی ہے اور نہ دلپذیری۔ میرے نزدیک ایسے افسانچوں کی حیثیت کترنوں، سے زیادہ نہیں ہے۔''

(مطبوعہ ماہنامہ تریاق، ممبئی ستمبر ۲۰۱۱ء ص ۳۷)

دراصل یہ صورتحال افسانچے کے فن سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جب کہ افسانچہ ایک مکمل کہانی کے ساتھ قاری کو جھنجھوڑنے والی کیفیت چاہتا ہے۔ اختصار اس کی پہچان ہے۔ موضوع کا اچھوتا پن اور ڈرامائی صورتحال، اختتام پر پڑھنے والے کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جوگندر پال کی رائے بڑی اہم لگتی ہے۔

''افسانچوں کے اختصار کو تاثر کی طویل ترین کیفیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''۔ (آتشیں لمحوں میں۔ عارف خورشید۔ پیش لفظ، جوگندر پال۔ ص ۷)

بقول جوگندر پال، جہاں افسانچہ بظاہر ختم ہوتا ہے وہیں سے وہ قاری کے ذہن میں شروع ہوجاتا ہے اس لحاظ سے افسانچہ مختصر ترین لفظوں میں اپنے اندر ایک طویل کہانی رکھتا ہے جو ختم ہونے پر بھی پڑھنے والے کے دماغ میں مسلسل جاری رہتا ہے اور اس طرح تادیر اس کا تاثر بنا رہتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں کہانی پن ہو۔ بقول نسیم محمد جان ''کہانی پن افسانچہ کی روح ہے''۔ (ص ۱۲۔ پل دو پل)

افسانچہ کی اس خوبی کی بناء پر عارف خورشید نے اسے اپنی ابتداء سے پہلے اور اختتام کے بعد جاری رہنے والا افسانہ کہا ہے۔ (وقت کے چاک پر۔ ص ۱۱۷)

اس خصوص میں چند افسانچے دیکھئے :

فاصلہ

''میں ان دنوں، کئی بار اپنے راکٹ میں بیٹھ کر چاند تک ہوآیا ہوں۔ لیکن ایک مدت ہوگئی، دس قدم چل کر اپنے بھائی سے ملنے نہیں گیا۔'' (سلوٹیں، جوگندر پال ص ۶۸)

محرومی

جب سے دشمنوں کی پہچان ہوئی ہے۔ دوستوں سے محروم ہوگیا ہوں۔ (پہلا پتھر۔ طالب زیدی، ص ۱۷)

''وہ خود اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں کیوں توڑ رہی ہے؟''

''کلائی دبا کر چوڑیاں توڑنے والا ہاتھ باقی نہیں رہا۔'' (آتشیں لمحوں میں، عارف خورشید۔ ص ۱۹)

چلن

''وہ شخص جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی، معجزاتی طور پر میرے بچ جانے پر مبارکباد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا۔'' (درد کے درمیاں۔ عظیم راہی۔ ص ۲۰)

نعم البدل

''ان لالچیوں نے زیبا کو اپنے والدین سے صوفہ، فریج، وی سی آر کے علاوہ موٹر سائیکل بھی لانے کو کہا تھا اور جب زیبا کے والدین یہ سب نہ دے سکے تو زیبا نے ان کے عوض اپنی جان دے دی۔''

(موم کی گڑیا۔ ساحر کلیم۔ ص ۲۵)

ان افسانچوں کے اختتام پر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کرنے میں افسانچہ نگار یہاں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ رہی بات لطیف انداز کی، یہ تو اس کے حق میں سم قاتل ہوتا ہے۔ طنز کی شدید نشتریت ہی اس کا مدعا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افسانچہ کی صنفی حیثیت پر حرف آنے لگا ہے۔ اس سقم کے سبب اکثر ناقدین تیر ہدف بناتے ہیں اور سینئر ممتاز افسانہ نگار اسے منہ نہیں لگاتے۔ ان کا ردعمل بھی بجا ہے لیکن کمزور افسانچہ نگار اپنی بات پر اڑے ہیں۔ ایسے افسانچوں کی بہتات کی ایک وجہ رسائل کے مدیران بھی ہیں جو بغیر کسی چھان پھٹک کے افسانچے چھاپتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ افسانچہ کو مقبول عام بنانے میں رسائل کے مدیران نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے لیکن اسے مسلسل اس طرح چھاپ کر افراط و تفریط کا ماحول بھی پیدا کر دیا ہے۔

اس پس منظر میں سلیم شہزاد کا یہ کہنا غلط نہیں۔ ''کچھ رسالوں اور اخباروں کے پیشہ ور مدیروں نے آگے بڑھ کر افسانچہ کو مقبولیت دینے کا بیڑا اٹھایا''۔ اور سلام بن رزاق کے لفظوں میں ''دوسرے لوگ جیسے تیسے جو بھی افسانچے لکھ کر لاتے ہیں انھیں رسالے میں چھاپ دیتے ہیں۔ انھیں اپنا پیٹ بھرنا ہے''۔ سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ چند پرچوں نے افسانچوں کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اسے خوب پروان چڑھایا ہے۔ اس خصوص میں شاعر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مدیر شاعر نے تو افسانچہ کو نئی زندگی عطا کی ہے اور اس کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ماہنامہ 'شاعر' نے افسانچہ پر کئی اہم چھوٹے بڑے گوشوں کا اہتمام بھی کیا ہے اور افسانچہ کو پوری ادبی دنیا میں متعارف کروایا ہے۔ 'شاعر' کی طرح دیگر ادبی رسائل جیسے کوہسار جرنل، زاویہ (سوئیڈن)، انشاء ادبی محاذ، قرطاس، اسباق اور بیباک وغیرہ نے بھی افسانچوں کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اس صنف کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کئی افسانچہ نگاروں کے گوشے بھی شائع کیے ہیں لیکن اب صورتحال الگ ہے۔ دراصل افسانچوں کی بہتات نے بھی اس کے معیار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ آج کل اور ایوان اردو اپنی ابتداء سے عائد پابندی کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔ اس امر پر غور و فکر کرنا وقت کی ضرورت ہے۔

کچھ نئے لوگ صرف افسانچہ لکھ رہے ہیں اور اپنی دانست میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ادب میں محض اس کی بنیاد پر اپنا نام بنا لیں گے۔ اس خام خیال کی طرف نورالحسنین، احمد صغیر و دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں نے بارہا توجہ دلائی ہے اور اپنی طرح نہ صرف افسانہ، بلکہ ناول لکھنے کی صلاح دی ہے۔ لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق یہ لوگ ابھی تک اپنی بات پر اڑے وہیں کھڑے ہیں۔ کوئی سمجھاؤ کہ ہم سمجھائیں کیا' والی بات ان پر صادق آتی ہے۔ افسانچے چھپوانے کی ہوڑ میں کچھ نئے لکھنے والے افسانچہ کے نام پر کبھی لطیفے لکھتے ہیں تو کبھی اقوال اور نشاندہی کرنے پر یوں چراغ پا ہو جاتے ہیں کہ بوکھلاہٹ میں لایعنی بکنے لگتے ہیں جبکہ بشیر مالیر کوٹلوی کے مشورہ کے مطابق ''نئے افسانچہ نگاروں کو تنقید کا برا نہیں ماننا چاہیے کہ اس سے ان کے فن پر نکھار آتا ہے۔'' اس سے یقیناً بہتر لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ خیر نئی نسل کو تو سمجھایا جا سکتا ہے لیکن اب اس ستم کو کیا کہا جائے کہ طنز و مزاح کے میدان کے کچھ کھلاڑی بھی افسانچے کی سرحد میں گھس آئے ہیں جو افسانچہ کی فضا کو مسموم کر رہے ہیں اور اس کی صنفی ساکھ کو مزید متاثر کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اس سارے ماحول کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہر کوئی افسانچہ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اب اس صورتحال کا کچھ نہ کچھ سدباب لازمی ہو گیا ہے۔ ایسے میں ادھر یہ بحث بھی چھیڑ دی گئی ہے کہ افسانچہ کتنی سطروں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کچھ لوگ سہ سطری کی بات کرتے ہیں تو کچھ سات سطروں کی لیکن یہ پیمانہ بھی اچھے افسانچے کی تخلیق کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ افسانچہ کی جامع تعریف کے مطابق مختصر ترین لفظوں اور کم سے کم سطروں میں ایک مکمل کہانی بیان کرنے پر تخلیق کار کو قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ اس مہارت پر ہی اچھے افسانچے کی تخلیق کا انحصار ہے اور یہ شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں آج کل افسانچے کے حصے میں مقبولیت کم اور مخالفت زیادہ ہاتھ آ رہی ہے اور اچھے افسانچے تخلیق کرنے والوں کا بھی نام خراب ہونے لگا ہے وہ بھی اس کی زد پر ہیں۔ اس صورتحال پر غور و فکر کی سخت ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس سخت آزمائش کے ماحول میں ایک اچھی پیش رفت ان دنوں یہ ہوئی ہے کہ چند سینئر افسانہ نگاروں نے بھی افسانچہ لکھنے کی شروعات کی ہے اگرچہ یہ لوگ باقاعدہ اس کی مخالفت میں نہیں تھے مگر پوری طرح موافقت میں بھی نہیں تھے۔ اس طرف ان کی توجہ ایک خوش آئند عمل ہے۔ ان لکھنے والوں میں نورشاہ، دیپک بدکی، ف۔ س۔ اعجاز اور محترم بانو سرتاج کے نام اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے ناقدین کے رویے میں بھی لچک پیدا ہوئی ہے جو سرے سے اس کے مخالف تھے۔ (باقی صفحہ ۴۴ پر)

مختلف ناموں سے لکھی جانے والی ایک مقبول صنف ___ افسانچہ

افسانچے کے سلسلے میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے کہ سعادت حسن منٹو نے ۱۹۴۸ء میں 'سیاہ حاشیے' کے ذریعے اردو میں افسانچے کی بنیاد ڈالی۔'سیاہ حاشیے' کے چھوٹے چھوٹے افسانے جنھیں محمد حسن عسکری نے لطیفے بھی کہا تھا' افسانچہ کی راہ میں بنیاد کا پتھر ثابت ہوئے۔ اکیسویں صدی کی ان دو دہائیوں میں اردو فکشن میں افسانچہ بہت مقبول ہو چکا ہے اور سوشل میڈیا پر افسانچہ کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ شیئر لائک اور کمینٹ کی دنیا میں ا فسانچہ کی مقبولیت اور شہرت کا عالم تو اظہر من الشمس ہے۔ افسانچہ جو افسانے کی ہیئت میں تبدیلی کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔ افسانچہ کی ابتداء تعریف اس کے فنی لوازمات اور اس کے ارتقائی سفر کے بارے میں' میں اپنے کئی مضامین میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ یہاں طوالت کے خوف سے ان کے اعادہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی موضوع کے لحاظ سے اس کی گنجائش ہے۔ افسانچہ کے سلسلے میں آج میرا موضوع اس کا اپنے نام افسانچہ کے بجائے مختلف ناموں سے لکھنے کا جو چلن عام ہو چکا ہے اس خصوص میں کچھ کہنا ہے۔

افسانچہ کا نام بدلنے کا یہ سلسلہ اس کے ارتقائی سفر سے جاری ہے۔ منٹو نے تو تقسیم ہند کے پس منظر میں 'سیاہ حاشیے' کے نام سے چھوٹے چھوٹے افسانے لکھے تھے۔ اس وقت شاید انھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ اسے صنف کے طور پر یوں برت کر مختلف ناموں سے پکارا جائے گا۔'سیاہ حاشیے' کے تقریباً دس سال بعد' منفرد لب و لہجے کے ممتاز و معروف شاعر اور ناقد ڈاکٹر مظفر حنفی نے بھی بڑی تعداد میں افسانوں کے ساتھ 'مشاہدات ارسطوثانی' کے نام سے افسانچے لکھے تھے جو ۱۹۵۹ء میں اپنے دوست حسن بشیر کے ساتھ جاری کردہ سہ ماہی ادبی رسالہ 'نئے چراغ' میں شائع ہوئے تھے جو بعد میں ان کے افسانوں کے تیسرے مجموعے 'دیدۂ حیراں' میں بھی افسانچے کے نام سے شامل ہیں۔ اس لحاظ سے مظفر حنفی نے 'ارسطوثانی' کے نام سے منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کی روایت کی تشکیل نو کی تھی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سب سے پہلے ماہنامہ 'شمع' (دہلی) نے مختصر مختصر کہانی اسی صفحے پر مکمل، کبھی آدھے صفحے پر مکمل کے عنوان سے مختصر ترین کہانیوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ 'شمع' ایک فلمی رسالہ تھا لیکن اس کا ادبی مواد بڑا معیاری ہوتا تھا بعد میں دیگر رسائل میں بھی مختلف ناموں سے مختصر ترین کہانیوں کی اشاعت کا سلسلہ دراز ہوگیا، ان میں کچھ نام نمک پارے' آتش پارے' نئی حکایتیں' نئی وارداتیں' ننھی منی کہانیاں اور پنکھڑیاں وغیرہ کے نام سے ان مختصر ترین کہانیوں کو چھاپنے لگے۔ ایک رسالے نے تو حد کردی افسانچہ کو 'مختصر افسانچہ' کے عنوان سے شائع کر کے اِس صنف کے ساتھ ایسا مذاق کیا جیسے برف کو کوئی 'ٹھنڈا برف' کہے۔ اِس طرح کی حرکتیں افسانچے کے ساتھ نام کے سلسلہ میں خوب ہوئی ہیں مگر افسانچہ بھی بڑا سخت جان ثابت ہوا ہے کہ وہ اپنے اصل نام سے ہی زیادہ مقبول ہے۔

اس صنف کے ساتھ شروع سے یہ ستم ظریفی رہی ہے کہ اسے مختلف ناموں سے لکھا جانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ افسانچہ غالب رجحان کے طور پر منی کہانی' منی افسانہ' مختصر مختصر کہانی کے نام سے لکھنے کا سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ اس دوران ۱۹۶۲ء میں جوگندر پال کے افسانوں کا مجموعہ 'میں کیوں سوچوں' شائع ہوکر منظر عام پر آیا جس میں ۳۵/افسانچے اسی نام سے پہلی بار منظر عام پر آئے۔ اسی طرح بعد میں جوگندر پال کے ہمعصر اور نامور سینئر افسانہ نگار رتن سنگھ نے بھی 'مانک موتی' کے نام سے افسانچے لکھے اور اسی نام سے اُن کے افسانچوں کا مجموعہ ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ناموں کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور منی کہانی اور منی افسانہ کے ناموں کے دم چھلے دیکھ کر جوگندر پال نے افسانچہ کہنے پر اصرار کیا اور یہ جواز پیش کیا کہ جب اردو میں افسانچے کا اتنا خوبصورت لفظ موجود ہے تو انگریزی کے minimum کے مخفی منی کو استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود (منی) کہانی' منی افسانہ کے ناموں سے افسانچہ کی اشاعت کا سلسلہ چلتا رہا اور اس طرح کا شوشہ بھی چھوڑا گیا کہ چند سطروں کی تحریر ہو تو افسانچہ اور ایک صفحہ کی کہانی ہو تو منی افسانہ یا منی کہانی' اس طرح کے استدلال بھی پیش کیے جانے لگے اسی کے ساتھ افسانچہ اور منی افسانہ و منی کہانی کے درمیان دو ایک امتیازی فرق بھی تلاش کر لیے گئے اور بحث و مباحث کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ اس تناظر میں ڈاکٹر مجید بیدار کا یہ اقتباس دیکھئے جو اس وقت کی صورتحال کا جائزہ پیش کرتا ہے :

''دورِ حاضر میں انسان کے لمحوں کی بے فرصتی اور مصروفیات کے بوجھل لمحات سے ایک ایسی نثری صنف عالم وجود میں آچکی ہے جس کو کسی ایک نام سے یاد کرنے کے معاملے میں خود تخلیق کار تذبذب کا شکار

ہیں۔ چنانچہ اس فن کو کبھی افسانچہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تو کبھی منی افسانہ، بعض تخلیق کار تو اُسے مختصر افسانے کی سرشت میں شمار کرتے ہیں۔ اب یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب لکھنے والے دونوں کے فن سے پوری طرح واقفیت کے ساتھ ان کو برت کر افسانے اور منی کہانی یا منی افسانہ تخلیق کریں تو وہ دن دور نہیں جب یہ دونوں علیحدہ علیحدہ اصناف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس تجربے کے ذریعے عمل میں آنے والی اصناف کو اگر صحیح طور پر واضح فرق کے ساتھ نہ برتا گیا تو اس تجربہ کا حشر بھی نثری نظم جیسا ہوسکتا ہے اور یہ کبھی اردو غزل کے نام سے تماشہ بن سکتا ہے۔ ساتھ ہی ایک صنف کی تسلیم شدہ حیثیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

(افسانچہ کا فن اور اس کی تخلیقی حیثیت۔ ص ۴۵، مطبوعہ کتاب نما۔ نئی دہلی۔ فروری ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر مجید بیدار اس صورتحال میں یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ افسانچہ کی صنفی حیثیت خطرے میں پڑ سکتی ہے اور اگر مختلف عنوانات کے سبب اس کے گنجلک ہونے کے ساتھ ہی اس کی تسلیم شدہ حیثیت بھی مشکوک ہو جائے گی لیکن اس صورتحال کے باوجود لکھنے والے مختلف ناموں سے لکھنے لگے، حالانکہ جوگندر پال کے اس منصفانہ موقف کے ساتھ لفظ افسانچہ رائج ہو گیا اور اس نام سے ہی بہت مقبول بھی ہوا ہے لیکن افسانچہ کی اس مقبولیت کے باوجود لکھنے والوں کو پھر کیا سوجھتی ہے کہ اسے بار بار نئے نئے ناموں سے لکھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور افسانچہ کی صنفی حیثیت پر پھر ایک نیا سوال لگ جاتا ہے کیا یہ افسانچہ ہی ہے یا پھر کوئی اور صنف ــــ اس طرح یہ سلسلہ اس کے ارتقائی سفر کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔ جوگندر پال کے ہمعصر اور نامور سینئر افسانہ نگار رتن سنگھ کے افسانچوں کا مجموعہ ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ جب افسانچہ کافی مقبول ہو گیا تو رسائل کے مدیران اسے بڑے اہتمام سے شائع کرنے اور نئے قلمکاروں کے اس کی سمت متوجہ ہونے سے افراط و تفریط کا ماحول بھی پیدا ہوا لیکن خدا کا شکر کہ افسانچہ کا یہ عبوری دور بھی جلد ختم ہو گیا اور اس کے لکھنے والے افسانچہ کے فنی رموز سے واقف ہو کر اس کی پیش رفت اور مقبولیت میں ہاتھ بٹانے لگے اور ان اشاعتوں کے اضافے کے سبب افسانچہ بہت مقبول ہونے لگا تو وہیں کہیں لوگوں نے اسے لطیفہ سے قریب کر دیا تو کہیں اسے کسی نے اخبار کی خبر کا حصہ بنا دیا تو کچھ اسے اقوال زریں سمجھنے لگے لیکن فنی استقام کے یہ بادل بھی جلد چھٹ گئے اور افسانچہ کے فن پر چھایا مطلع صاف ہو کر پھر وہ مقبولیت کی بلندی کو چھونے لگا' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر ناموں کا وہی چکر شروع ہو گیا۔ ایک سطری کہانی، راک کہانی، پوپ کہانی، ننھی منی کہانی، آتش پارے، کٹ اپ تکنیک افسانچے جیسے ناموں سے اسے لکھا جانے لگا حالانکہ افسانچہ اپنے اصل نام اور اپنے مکمل فارم کے ساتھ اپنی جگہ برقرار ہے اور اسی کی شناخت اس طرح مستحکم ہے اور وہ اتنا ہی مقبول بنا ہوا ہے اور آگے بھی انشاءاللہ رہے گا۔

یہ بات بھی سب پر عیاں ہے کہ افسانہ تو سب کے لیے آج بھی افسانہ ہی ہے حالانکہ افسانہ پہلے طویل مختصر افسانہ افسانہ، جدید افسانہ' نیا افسانہ اور عصری افسانہ جیسے ناموں سے موسوم ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ سب دم چھلے از خود نکل گئے اور آخر میں افسانہ کا نام افسانہ ہی رہا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسانچہ کیوں مختلف ناموں سے موسوم کیا جا رہا ہے اور افسانچہ کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟ افسانچہ اب ایک ایسی صنف بن گئی ہے جسے مختلف ناموں سے پورے تواتر کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے لکھنے والوں کی کیا حکمت ہے اور کیا مصلحت کارفرما ہے یہ وہی جانیں جو نام بدل بدل کر افسانچے لکھ رہے ہیں۔ اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ موجد بننے کے چکر میں یہ سب ہو رہا ہے۔ یہ بدعت افسانچے کے معاملے میں ایک عرصے سے جاری ہے۔ یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ افسانچے کو اس کے اصل نام سے لکھنے میں کیا قباحت ہے؟ اب تو ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ بچوں کے لیے لکھیں تو اسے 'افسانچۂ اطفال' کا نام دیا گیا ہے تو کسی نے 'طفلانچے' کہا اور کسی نے 'بچکانچے' کا نام دیا اور باقاعدہ اس کے مجموعے بھی چھپ رہے ہیں۔ ذرا سنجیدگی سے سوچئے 'بچکانچہ' کس قدر بچکانہ لگتا ہے۔ اس صورتحال پر کسی منچلے نے یہ شوشہ چھوڑ دیا، وہ اگر 'زنخکانچے' لکھیں تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ ادھر کسی نے کہیں لکھا ہے کہ افسانچے کے طرز پر 'طنزانچے' لکھے جا رہے ہیں، کیا طنز کی بنیاد پر انھیں افسانچہ سمجھا جائے اور اس کا نام طنزانچہ رکھا جائے جبکہ طنزانچے کا تعلق طنز و مزاح سے ہے افسانچے سے ہرگز نہیں۔ ایسے میں ایک صاحب نے مجھے مشورتاً کہا کہ آپ خواتین کے لیے 'نسوانچے' کیوں نہیں لکھتے۔ ویسے افسانچہ اب ایسی صنف بن گیا ہے کہ ہر کوئی اس میں طبع آزمائی کر رہا ہے لیکن اکثر کی اس فن سے لاعلمی اور عدم واقفیت کے سبب افسانچے کی صنفی حیثیت متاثر ہوئی ہے اور وہیں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ قلمکار جن کا دوسری اصناف میں اچھا خاصا نام بنا ہوا ہے وہ بھی اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں جس سے افسانچہ کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہو رہا ہے مگر اصل معاملہ وہی ہے کہ افسانچہ کو اُس کے اصل نام سے ہی لکھنے کی ضرورت ہے۔

ISSN 2320-6519

اِن حالات میں میرا خیال تو یہ ہے کہ افسانچہ' بچوں کے لیے لکھیں یا خواتین کے لیے' وہ افسانچہ ہی رہے گا۔ اگر وہ افسانچہ کے فارم و ہیئت اور فنی لوازمات کے مطابق لکھا جائے گا۔ اس طرح مختلف خانوں میں رکھ کر اسے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح الگ الگ نام دے کر لکھنے سے اس کی اکائی بھی متاثر ہوگی اور اس تفریق سے صنفی حیثیت مشکوک بھی ہوگی اور افسانچہ کے مخالفین کو اس کے بارے میں مزید باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ عجیب بات ہے منی کہانی اور منی افسانہ انگریزی لفظ minimize کے مخفف منی کو شامل کر کے لکھا جاتا ہے۔ بقول جوگندر پال افسانچہ کا اتنا اچھا اردو لفظ ہمارے پاس موجود ہے تو انگریزی لفظ کے سہارے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف نام بدل کر لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے فارم کو بھی بدلنے کی ضرورت ہوگی۔ لفظ 'افسانچہ' پہلے سے ہی صنف کی حیثیت سے موجود ہے تو اسے نئے نام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ منطق بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ محض اس کا نام بدلنے سے کیا لوگ اس کے موجد بن جائیں گے؟ یہ جواز نظر نہیں آتا ہے، البتہ اس طرح نام بدلنے کے سبب صنف افسانچہ کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ جس نے اس کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنا دیا ہے اور اس کی مقبولیت سے حسد کر کے اسے معتوب کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ریحان کوثر کے افسانچوں کا مجموعہ ''سولفظوں کی کہانیاں'' کے نام سے حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹائٹل میں 'سولفظوں کی کہانیاں' اور نیچے قوس میں افسانچوں کا مجموعہ لکھا گیا ہے۔ اس مجموعہ سے ''اپنی بات'' کے تحت افسانچہ نگار کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں :

''__ اکثر افسانہ نگار افسانچے کو سرے سے خارج ہی کر دیتے ہیں اس پر مزید ستم یہ ہے کہ صنف افسانچہ کے میدان میں اب مختلف قسم اور رنگ کے پرچم نظر آنے لگے ہیں۔ منی افسانہ، منی کہانی، افسانچہ اطفال، بچکانچہ، سو لفظی کہانی، پچاس لفظی کہانی، مائیکرو فکشن ، مائیکرو کہانی، کہانی چند لفظوں میں وغیرہ وغیرہ۔ کئی علم بردار نظر آتے ہیں۔ ویسے یہ کوئی بری بات نہیں! بلکہ یہ صحت مند مقابلے کے لیے خوش آئند بات ہے لیکن سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ سبھی آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں بھی کر رہے ہیں اور یہ بڑے ہی افسوس کا مقام ہے۔ دراصل یہاں متحد ہو کر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔'' (ص ۱۹)

اس صورتحال کا ریحان کوثر نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ یعنی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ' ہر قلمکار نے افسانچہ کے نام پر جیسے اپنی ایک الگ دنیا بسانے کی کوشش کی ہے اور آخر میں انھوں نے ایک صحت مند مشورہ بھی دیا ہے جس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور اس صحت مند نظریہ کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ مثبت انداز فکر کے ساتھ افسانچہ کے ان ناموں کو صنف افسانچہ کی توسیع سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بشرط یہ کہ قلمکار مل بیٹھ کر یہ طئے کر لیں کہ اس کے حق میں کیا بہتر ہوگا۔ مگر اِس کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل کی ضرورت ہوگی۔ بہر حال اس اہم مسئلہ کی طرف ہم سنجیدگی سے توجہ دیں تو کسی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ہم سب مل کر یعنی افسانچہ لکھنے والے قلمکار افسانچہ کو افسانچہ کے نام سے ہی لکھیں تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا اور 'افسانچہ' محض موضوع بحث بننے کی بجائے ایک اہم صنف کے طور پر مزید مقبول ہوگا اور اس کی پیش رفت میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ ورنہ نئے ناموں کے اس چکر کے ساتھ افسانچہ پر بحث کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا اور اس سے نہ صرف صنف افسانچہ کی ساکھ مزید متاثر ہوگی بلکہ اِن مختلف ناموں کی وجہ سے افسانچہ کا متنازعہ صنف بن جانے کا امکان بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

یہاں میں نے ڈاکٹر مجید بیدار کے بیان سے بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں افسانچوں کے نام کو بدلنے کی صحیح صورتحال سے واقفیت کرواتے ہوئے' اور اکیسویں صدی کی اِن ابتدائی دو دہائیوں میں نام بدلنے کے اِس غالب رجحان کو ریحان کوثر کے اقتباس کو پیش کرتے ہوئے اپنے موقف کو مدلل واضح انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا اصرار یہی ہے کہ افسانچہ کو اُس کی ہیئت و فارم اور اُس کے فنی لوازمات کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے اُس کے اصل نام سے ہی تخلیق کیا جائے تو اُس کے روشن مستقبل کے لیے یہ بہتر ہوگا۔ دراصل افسانچہ ایک ایسی مقبول عام صنف بن گئی ہے کہ جو اِس کے فنی لوازمات سے پوری طرح واقف نہیں ہے وہ بھی اِس میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اِس سے بھی اِس کی صنفی حیثیت کا نقصان ہوا ہے۔ لہٰذا آخر میں پھر یہی کہوں گا کہ اِس کے سدباب کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے ہم متحد ہو کر اِس سلسلے میں غور و فکر کریں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے یہ صنف افسانچہ کے سلسلے میں وقت کی ایک اہم ضرورت بھی ہے۔

☆☆☆

رباعی

(ڈاکٹر عظیم راہی کے لیے)

افسانچہ رجحان عظیم راہی
ہاتھ آئی شہرت بھی انھیں من چاہی
افسانچے کی راہ بھی ہے ایک مگر
دیگر کئی راہوں کے بنے یہ راہی

بقلم شاہ حسین نہری

ڈاکٹر عظیم راہی کے منتخب افسانچے

خوبی

ہروقت کسی نہ کسی کی برائی کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔
جب وہ کسی کی برائی کرتا تو اس انداز سے اس شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا کہ سامنے والے کو اس شخص نفرت ہو جائے۔
لیکن !اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کی برائی کر رہا ہے۔

☆

راز

ہر وہ شئے جو کسی نہ کسی پردے میں چھپی رہتی۔ اُسے دعوتِ نظارہ دیتی، اسے دیکھنے کی خواہش ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہتی اور ہر پردے میں رہنے والی چیز کو بے نقاب کرنا چاہتا۔
اپنے اسی مقصد کے تحت ایک روز اس نے ایک چہرے سے نقاب ہٹائی لیکن گھبرا کر دوسرے ہی لمحے وہ نقاب ڈال دی۔
کیونکہ اس بے نقابی میں اُسے اپنی زندگی کا راز فاش ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

☆

زرمبادلہ

''تم تو بہت اصول پسند تھے۔ اور وضعدار بھی۔
لیکن آج جو تم نے کیا ہے یہ سب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ہے اور افسوس بھی۔''
اُس کے آفس کے ساتھی نے یوں کہا جیسے طنز کر رہا ہو۔
''ہاں میری اصول پسندی ہی تھی جو دیمک کی طرح چاٹتی رہی' کھوکھلا کرتی رہی اور وضعداری کی سچائیاں زہر بن کر قطرہ قطرہ میرے لہو میں اترتی گئیں اور پھر آخر میں کرتا بھی تو کیا۔

وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔
''ہاں' میں نے اپنی جواں بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے' بہت دور سمندروں کے اس پار بوڑھے شیخ کے ہاتھ شادی کے نام فروخت کر دیا ہے۔''
جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ پھر ایک دم رندھے ہوئے گلے سے بولا :
''مگر صرف اس لئے کہ دوسری دو جوان بیٹیوں کو یہاں اپنے ملک میں بیاہ سکوں۔''
(ماخوذ 'پھول کے آنسو')

☆

لاحاصل

میں تنہا تھا اور ایک میری تنہائی تھی .....
ایک دن سوچا ..... سب سے کٹ کر جینے کا مزہ کیا ہے؟
یہی سوچ کر میں نے شادی کر لی۔
بچے ہوئے ..... بچے بڑے ہوئے اور پھر رشتہ داریاں بڑھیں قافلہ بنا اور سب اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے۔
لیکن ایک بار پھر میں اکیلا ہو گیا .....
اب میں سوچتا ہوں کہ سب کے ساتھ بس کر بھی مجھے کیا ملا؟
وہی تنہائی اور اپنے ایک اکیلے پن کے احساس کے سوا!

☆

ورثہ

''یہ گھر جو تم اپنے لئے بنا رہے ہو اتنی دوڑ دھوپ اٹھانے کے بعد' اس قدر پریشانی اور تکالیف سہنے کے بعد کیا اس گھر میں رہ بھی سکو گے؟''

''میں جس مکان میں اب تک رہتا آیا ہوں وہ بھی میں نے نہیں بنایا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا اطمینان ضرور ہے کہ اس گھر میں میرے بچے بڑے سکون سے رہ سکیں گے۔ جس طرح میں نے اپنے آبائی مکان میں ایک عمر گزار دی۔''

☆

مردانگی

وہ زندگی بھر کنواری رہی۔
کیونکہ محبت کے حسین' سبز باغ تو اُسے سب نے دکھائے تھے۔
لیکن شادی کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔
شاید اس لئے کہ
اس کی زندگی میں آنے والے وہ سارے مرد
شادی شدہ تھے .....!!
(ماخوذ 'درد کے درمیان')

☆

فاصلے

بیل گاڑی کی جگہ بس اور ریل گاڑی نے شہروں کے فاصلے سمیٹ کر کم کر دیئے.....ہوائی جہاز نے ملکوں کے فاصلے منٹوں میں کم کر دیے۔ نئی تکنالوجی نے مواصلات کے نظام کو اس طرح عام کر دیا کہ سب ایک دوسرے سے پل بھر میں قریب ہو گئے ہیں۔
''ہاں لیکن ان کوششوں میں آدمی ، آدمی سے دور ہو گیا۔''

☆

سچائی

وہ اپنے بچپن میں بڑوں کو اکثر لاجواب کر دیتا تھا۔
اور آج جب اس کے بچے نے اسے لاجواب کر دیا تو اسے بڑی شدت سے اس سچائی کا احساس ہوا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

☆

سہاگ کی آگ

اس نے ایک زوردار وار اس کے سر پر کیا۔ آخر بڑی کوشش کے بعد اس درندہ صفت مرد کے چنگل سے، اپنی جوان بیٹی کی عزت بچانے میں وہ کامیاب ہوگئی۔
لیکن اس بچاؤ میں اسے اپنے ہی سہاگ سے ہاتھ دھونا پڑا کہ وہ درندہ کوئی اور نہیں اس کا شوہر تھا۔

☆

جگہ

اس کا دوست اچانک اپنے آبائی گھر سے کرایہ کے مکان میں آ گیا تو اس تبدیلی پر اسے بڑی حیرانی ہوئی کہ اس کے ذاتی مکان میں جگہ کی کمی نہیں تھی۔
اس معاملے پر جب اس نے اپنے دوست سے استفسار کیا تو وہ تڑپ کر بول اٹھا۔ ''مکان میں نہیں، وہاں رہنے والوں کے دلوں میں جگہ کم ہوگئی تھی۔''

☆

بوجھ

باپ کے مرنے کے بعد، اس کی اولاد کو باپ کی ایک مہینے کی بیماری پر خرچ ہوئے ایک لاکھ روپیوں کا بوجھ، اس کی موت سے بھی کئی گنا زیادہ تھا۔ اس سبب وہ سب مقروض ہوگئے تھے۔

☆

وابستگی

ضعیف باپ کو بیوی کے بار بار کہنے پر وہ اولڈ ہوم (Old Home) میں چھوڑ آیا۔
چند دن گزر جانے کے بعد بچوں کو دادا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ دادا دادا کی رٹ لگائے بے طرح یاد کرنے لگے اور ان کے لیے اپنے ماں باپ کو تنگ کر دیا۔
مجبوراً وہ اپنے بوڑھے باپ کو اولڈ ہوم (Old Home) سے واپس لانے وہاں پہنچا تو باپ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہاں اس کا دل لگ گیا ہے۔''
(ماخوذ 'کل اور آج کا غم)

☆

مشترکہ تجویز

ایک مشترکہ خاندان میں بڑا بھائی کئی دنوں سے ماں باپ کو اولڈ ہوم میں چھوڑنے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ جب اس کی خبر چھوٹے بھائی کو ہوئی تو اس نے تجویز پیش کرتے ہوئے بڑے بھائی سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔
''بھائی جان' ابھی انھیں یہیں رہنے دیں کہ امّی ہماری بیویوں کا ہاتھ بٹائیں گی اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرے گی اور بابا گھر کے باہر کے کاموں میں ہماری مدد کریں گے''۔
بڑے بھائی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کہا۔
''ہاں' چھوٹے' اس طرح ہم ملازمہ کے بے جا اخراجات کے ساتھ ان کے ناز ونخرے جھیلنے سے بھی بچ جائیں گے''۔
یہ سن کر چھوٹا بھائی تڑ کے بولا ''ہاں' جب ماں باپ ہمارے کوئی کام کے نہیں رہیں گے تو ہم انھیں اولڈ ہوم میں چھوڑ آئیں گے۔''

☆

معمول

وہ دن بھر اپنے دوستوں کی' دوسروں کے سامنے برائیاں کرتا اور ان کے خلاف بولتا اور ان کے بیچ کوئی سازش کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔
لیکن اس کی مشکل یہ تھی کہ ان کے بغیر بھی اس کا دل نہیں لگتا۔ شام میں جب کہیں دوستوں کی محفلیں سجتیں تو وہ بھی شامل ہو جاتا۔
ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے بارے میں تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔
ان کے بغیر اس کا جی جو نہیں لگتا تھا کہ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا اور ایک ادھورے پن کا احساس اس کے رگ وپے میں سما جاتا۔
آخر وہ سب اس کے گہرے دوست تھے۔

☆

بدلا ہوا فیصلہ

پتنی کی روز روز کی تکرار سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ وہ بڑی تشویش میں مبتلا تھا کہ کیا کریں؟ ایک طرف ماں کی ممتا ہے تو دوسری طرف بیوی کا پیار۔ وہ جذبات کی شدت میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اسی تذبذب کے عالم میں' وہ بغیر کچھ کھائے پیئے دفتر کے لیے نکل پڑا۔ اسی اثناء میں اس کی پتنی کو اس کے پتا کا فون آیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ''اس کی بہو اسے برداشت کرنے تیار نہیں ہے۔ وہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہے کہ وہ گھر چھوڑ دیں۔ اور تمہارا بھائی بھی خاموش ہے۔ کیا کچھ دنوں کے لیے بیٹی تمہارے گھر آ جاؤں؟
پتا کے سوال پر وہ خاموشی کی مورتی بنی' اپنے آپ میں الجھتی ہوئی بس سوچتی رہ گئی کہ اب کیا کریں؟
معاً اس نے اپنی ساس کو اولڈ ہوم میں چھوڑنے کا اپنا فیصلہ بدل دیا۔

☆☆☆

تعارف و تبصرے

کتاب کا نام : صوتی اور جینی آلودگی

(Noise and Genetic Pollution)

مصنف : پروفیسر رفیع الدین ناصر

(8830986377)

اشاعت : ۲۰۲۳ء

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

قیمت : ۲۰۰/روپے

مبصر : ڈاکٹر یوسف صابر (9326772575)

خوبصورت معنی خیز کور پیج اور دبیز کاغذ کے استعمال سے سجی ۱۷۶ صفحات پر مشتمل صوتی اور جینی آلودگی نام کی یہ کتاب ماحولیاتی سائنس کے موضوع پر انتہائی اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ یہ پروفیسر رفیع الدین ناصر کی پینتالیسویں کتاب ہے جو (۱۳) ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کے ابواب کے نام اس طرح ہیں۔ (۱) صوتی آلودگی کیا ہے؟ (۲) آواز کی درجہ بندی (۳) آواز کی خصوصیات (۴) آواز کی قسمیں (۵) صوتی آلودگی کے اثرات (۶) صوتی آلودگی کے احتیاطی تدابیر۔ حصہ دوم کے ابواب اس طرح ہیں: (۷) جینی آلودگی کیا ہے؟ (۸) جینی آلودگی کے مختلف مسائل (۹) جینٹک انجینئرنگ اور انسانی زندگی (۱۰) جینی آلودگی کے حیوانات پر اثرات (۱۱) جینی آلودگی کے نباتات پر اثرات (۱۲) جینی تغیر شدہ فصلیں ضرورت اور جانچ (۱۳) جینی تغیر شدہ فصلوں کے قوانین اور حیاتی تحفظ۔ تمام ابواب کے نام انگلش سے اردو اصطلاحی صورت میں تحریر کئے گئے ہیں یہ ایک مشکل کام ہے، محنت طلب ہے، جسے پروفیسر رفیع الدین ناصر نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ تمام ابواب کے نام اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں تحریر کئے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہو۔ صوتی آلودگی پر کچھ تحریریں پڑھنے مل جاتی ہیں لیکن جینی آلودگی ایک نیا موضوع ہے جس کا پورا پورا حق پروفیسر رفیع الدین ناصر نے ادا کیا ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ناصر نے اس کتاب میں شامل تمام ابواب کو سمجھنے اور سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ کئی جگہ اردو و انگلش دونوں الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے اور خصوصاً طلباء و طالبات کو سائنسی معلومات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ضرورت کے مطابق کتاب میں تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کے ابتداء میں قومی اعزاز یافتہ معلم پروفیسر رفیع الدین ناصر کا مختصر تعارف ہے جو ان کی بے انتہا قیمتی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد ''رشحاتِ قلم'' عنوان کے تحت پروفیسر رفیع الدین ناصر نے اس کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ تحریر کیا ہے :

''بیشتر اردو قاری آج بھی جینی آلودگی سے واقف نہیں اور غیر دانستہ طور پر تغیر شدہ غذاؤں کا استعمال کر رہے ہیں جو نہ صرف ہمارے جین کو متاثر کر رہی ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہو رہی ہیں۔''

یہ کتاب کتنی فائدہ مند ہے پروفیسر رفیع الدین ناصر کے مذکورہ اس بیان سے واضح ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ پروفیسر جمال نصرت (لکھنؤ) نے تحریر کئے ہیں اور اس شعر پر اپنی بات ختم کی ۔

خیال میرا ہی آیا تجھے یہ بات الگ
دعا یہی ہے تری زندگی سنور جائے

کتاب کے کور پیج پر سید اختر علی اور ڈاکٹر خلیل تماندار کے چند تعریفی کلمات ہیں جو اس کتاب کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے انگلش اور اردو دونوں زبانوں میں مہارت رکھنے والا قلمکار ہی تحریر کر سکتا ہے اور پڑھنے والے کے لئے بھی اردو کے ساتھ انگریزی زبان کی تھوڑی بہت جانکاری ضروری ہے، ورنہ اسے سمجھنے میں دشواری ہو سکتی ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ناصر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ماہر ہیں اور دونوں زبانوں کی مدد لے کر وہ علمی و ادبی خدمات بڑے سلیقے سے انجام دے رہے ہیں اور اپنی معلومات کا عوام کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کتاب ISBN کے ساتھ ہے، امید ہے کہ ریسرچ کرنے والے طلباء و طالبات بھی حوالہ جات کے لئے اس کتاب کا استعمال کریں گے۔ اس کتاب کو مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
شالیمار بک ہاؤس، سٹی چوک، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

☆☆☆

سرابوں کا سفر (منظوم خودنوشت سوانح مثنوی)

شاعر : ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی

اشاعت : ۲۰۲۲ء

قیمت : ۴۰۰/روپئے

طباعت : دلّی کتاب گھر، ۳۹۶۱ گلی خان خاناں، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

مبصر : ڈاکٹر یوسف صابر (9326772575)

براؤن رنگ کے کاغذ کے استعمال و مضبوط بائنڈنگ والی ۳۶۸/صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مقدمہ خود

مصنف نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

''اس کتاب کا نام 'سرابوں کا سفر' رکھا ہے۔ اس خودنوشت سوانحی مثنوی میں میری حیات کے تمام نشیب وفراز موجزن ہیں۔مثنوی کا یہ عنوان اپنے ہی ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔''

اس مثنوی کا نام ''سرابوں کا سفر'' شاعر کی حقیقی زندگی کے واقعات سے مطابقت رکھتا ہے اور اگر گہرائی میں اُترا جائے تو انسان کی زندگی سرابوں کے سفر کے سوا اور کیا ہے؟ ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی کی اس مثنوی میں ان کے زندگی کے تمام اہم واقعات ترتیب وار درج ہیں۔ موصوف نے مختلف عنوانات کے تحت مثنوی کو آگے بڑھایا ہے۔حمد، نعت اور مناقب کے بعد اپنے والد کے لئے مرثیہ تخلیق کیا ہے۔اس کے بعد صفحہ نمبر ۶۷ سے مثنوی آغاز کی ہے۔مثنوی کے آغاز سے اختتام تک کے واقعات کے عنوانات اس طرح ہیں :

☆ عمر کے چھ برس سے دس برس تک کے نا قابل فراموش واقعات ☆ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء کے نا قابل فراموش واقعات ☆ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء کے نا قابل فراموش واقعات ☆ شہر ناندیڑ کا ادبی ماحول ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۱ء تک ☆ ہم سے منسوب ہوا تلخ حقیت بن کر۔ وہ فسانہ کہ جسے شہر کا گھر گھر جانے ☆ تعلقہ کنوٹ کی سماجی ، ادبی، تعلیمی خدمات کا مختصر احوال ☆ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۸ء تک کے اہم واقعات ☆ آل مراٹھواڑہ اردو کنونشن ۱۹۶۹ء ☆ ایک یادگار تقریب عید ملاپ ☆ شنکر راؤ جی چوہان کا یادگار قدم ☆ پھر ۱۹۸۷ء میں نیا ایک در کھلا ☆ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۸ء کے یادگار واقعات ☆ حضرت والد کی رحلت ☆ نومبر ۱۹۹۸ء کا ایک یادگار سفر ☆ ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۸ء کے واقعات (رفیقۂ حیات آمنہ فہیم کا انتقال پُر ملال) ☆ ریفریشر کورس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے نا قابل فراموش واقعات ☆ یہ حقیقت سراب کی سی ہے ☆ کالج کا یادگار وداعی جلسہ ☆ انعامات و اعزازات کا سلسلہ (۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۶ء کے اہم ترین واقعات کا احوال) ☆ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کا لائف اچیومنٹ ایوارڈ ☆ سہ روزہ جشن فہیم احمد صدیقی شہر مالیگاؤں ☆ اعزاز ''فخر مراٹھواڑہ'' ☆ این سی پی یو ایل، دہلی کے دو پینلس کی رکنیت ☆ ادارۂ ادبی اسلامی کا ''حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شاعری'' ☆ ''کلیاتِ نثر و نظم ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی'' پرنسپل ڈاکٹر تبسم ناز، کرناٹک کی تنقیدی اور تخلیقی تالیف ☆ شہر حیدرآباد میں پچاس سالہ اردو خدمات کا اعتراف (عظیم الشان جشن) ☆ ۲۰۱۹ء سے مارچ ۲۰۲۱ء کی مصروفیات ☆ ۲۰۲۰ء میں سارے عالم پر کورونا کا قہر ☆ فرزندِ کلاں ڈاکٹر ندیم احمد صدیقی کا سانحہ ارتحال ☆ اختتامیہ۔

ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی نے منظوم سوانح حیات بصورت مثنوی تخلیق کر کے اردو زبان و ادب میں نہ صرف ناندیڑ بلکہ مراٹھواڑہ سطح پر نا قابل فراموش اپنی منفرد و مستند خدمت انجام دی ہیں۔عبدالعزیز نے بعنوان میر مجلس، رونق محفل، فہیم صدیقی اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں ایک جگہ تحریر کیا ہے :

فہیم تخلیقی صلاحیتوں کے حامل اور شرعی غیر شرعی عیوب کی حامل شخصیت تھی۔صیغۂ ماضی میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔نہ جانے کیا جلدی تھی کہ سفر آخرت اختیار کیا۔فہیم پختہ شعر گو اور صاحب علم تھے۔''

اس کتاب کے آخر میں نظم و نثر کی شکل میں تعزیتی پیغامات شامل ہیں۔ جن قلمکاروں نے پیغامات ارسال کئے ان کے نام یوں ہیں: پروفیسر سید شجاعت علی، اسلم مرزا ، ڈاکٹر عبدالکریم سالار، ڈاکٹر اقبال پاشاہ، پروفیسر مہ جبیں (نجم) غزال ، صلاح الدین نیر، پروفیسر ڈاکٹر پروین فاطمہ، عزیز احمد اثر رحمانی، ڈاکٹر محمد کلیم ضیاء، ڈاکٹر سید منور علی رضوی، احمد سوز، ایڈوکیٹ بہاء الدین، غلام صمدانی، خان شمیم، ڈاکٹر علیم الحق مظہری، شیخ علیم اسرار، محمد تقی، اظہر حیات، انتخاب حمید، سہیل احمد صدیقی ، ڈاکٹر عبدالرب، ضیاء الدین اور عبدالعزیز۔

مثنوی ''سرابوں کا سفر'' ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی کی دو برسوں کی محنت کا ثمر ہے۔اس مثنوی کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

سر جھکا کر میں نے یہ ان سے کہا
مجھ کو ہے منظور سب کا فیصلہ
اس طرح گھر آئی میرے آمنہ
میں نے تو پہلے اسے دیکھا نہ تھا
فون یوسف خان صابر نے کیا
یہ کیا ''عکس ادب'' نے فیصلہ
مالیگاؤں علم کا مرکز قدیم
منعقد ہوگا یہاں جشن فہیم
ہوچکی ہے مثنوی میری تمام
دو برس سے کر رہا تھا اس پہ کام
ہے مکمل مثنوی میری مگر
جاری ہے اب بھی ''سرابوں کا سفر''

واقعی ''سرابوں کا سفر'' ابھی جاری ہے اور دعا ہے کہ تاقیامت جاری رہے۔ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے اور اس بات کی تصدیق ان کی تخلیق کردہ مثنوی سرابوں کا سفر کر دیتی ہے۔اس کتاب کو اس پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔دفتر اردو اکیڈیمی، مکان نمبر ۹۱۱-۶-۱، نظام کالونی، ناندیڑ۔ ۴۳۱۶۰۵ (مہاراشٹر) موبائل:9158326129

☆☆☆

''لہجوں کی مہک''

تاثراتی وتجزیاتی مضامین (حصہ اول)

مصنف: سراج زیبائی مرتبہ: ڈاکٹر سجاد حسین

تبصرہ نگار : رفیق جعفر (پونہ) 9270916979

لہجوں کی مہک سے دل کا آنگن لفظوں کا نشہ اچھالتا ہے
گرتا ہے اگر کبھی زمانہ تو شاعر کا قلم سنبھالتا ہے

اس کتاب کا نام سراج زیبائی نے اپنے ہی ایک مطلع سے لیا ہے۔ تاثراتی اور تجزیاتی مضامین کی اِس کتاب کا یہ نام خوبصورت بھی ہے اور نثر کی اس کتاب پر زیب بھی دیتا ہے۔ سراج بنیادی طور پر مشاق شاعر ہیں۔ کتاب کے پشت پر ساغر نظامی، علی سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، دانش فرازی، کاوش بدری، قمر رئیس، ندا فاضلی، باقی، عزیز تمنائی اور قیصر الجعفری جیسی نامور ادبی شخصیات کی آراء ان کے اچھے شاعر ہونے کا ثبوت ہے، لیکن یہ آراء ان کے شعری مجموعے پر زیب دیتی تھی۔ یہ کتاب تو ان کی نثر کی کتاب ہے۔

''لہجوں کی مہک'' ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے اور ایک مجموعہ ان کی شاعری پر مشاہیر ادب کے تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہوا کہ عرصۂ دراز سے قلم اور قرطاس سے اِن کا رشتہ مضبوط ہے۔ ان کی اس نئی کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سید سجاد حسین نے لکھا ہے جو مرتب بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مصنف کا تعارف مؤثر طریقے سے قارئین سے کروایا ہے۔ اس کے علاوہ خلیل مامون، ڈاکٹر حیات افتخار اور ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کے مضامین مشمولات کے مواد کا تعارف کرواتے اور داد سے نوازتے نظر آتے ہیں۔ قاری جب اِن مضامین کا مطالعہ کر لیتا ہے تو کتاب پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کچھ مشہور اور کچھ کم مشہور فنکاروں پر تاثرات رقم کئے گئے ہیں ان میں کچھ نام ایسے بھی نظر آئے جن کے فن پر شاید ہی لکھا گیا ہو یا کم لکھا گیا ہو کہ مصنف کا یہ طریق کار قابل داد اور قابل تقلید ہے۔ مصنف نے اپنے نقطۂ نظر سے فنکاروں کو دیکھا اور دکھایا ہے اور کچھ مضامین میں چونکایا بھی ہے۔ میں نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے اور یہ پایا ہے کہ مصنف کا ذوق ستھرا اور اعلیٰ ہے اور زیادہ سادہ ہے۔ اس کے علاوہ اختصار میں بات کرنے کا ہنر مصنف کو آتا ہے۔

سراج زیبائی نے شعراء کے جن اشعار کو حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے ان میں شعراء کے لہجوں کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے۔ مثالیں تو کئی ہیں صرف چار اشعار سے اندازہ لگائیے ۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم یاد آئے
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم یاد آئے
(فیضؔ)

لذتِ لمس سے ہر عضو گرہ کھولے ہے
تو ہے خاموش مگر جسم ترا بولے ہے
(دانش فرازی)

تیرے بغیر میری مکمل کہاں کتاب
گویا وجود میرا تیرا اقتباس ہے
(کاوش بدری)

میری ایک چھوٹی سی کوشش تجھ کو پانے کے لئے
بن گئی مسئلہ سارے زمانے کے لئے
(ظفر گورکھپوری)

ایسے کئی اشعار اس کتاب کی زینت بنے ہیں اور اِن پر مصنف کا اظہار یہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔ شموگہ (کرناٹک) کے منفرد اندازِ سخن کے شاعر ساجد حمید کے فن پر مصنف رقم طراز ہے: ''ساجد حمید کی شاعری میں نئی آواز سنائی دیتی ہے جو نئی سمت کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی بلیغ ترجمانی کی ہے۔ اپنے عہد کی سچائیوں کی نقاب کشائی اس طرح کی ہے۔ کہتے ہیں ۔

جبر دیکھا ہے مگر ایسا نہیں دیکھا ہے
ایسے پہرے ہیں کہ پلکیں میں اٹھا نہ سکوں
بظاہر یوں تو میں بکھرا ہوا ہوں
مرے اندر مگر ٹوٹا نہیں کچھ

یہ تو بطور مثال پیش کی گئی باتیں ہیں۔ اس کتاب میں جس پر بھی سراج زیبائی نے لکھا ہے اپنے تعین کو پورا انصاف کرنے کی نیت سے لکھا ہے۔ کہنا تو بہت کچھ ہے مگر تبصرے کے حدود کی مجبوری ہے۔ بہر حال سراج زیبائی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے خود فنکار ہو کر اپنے ہم عصر فنکاروں کی کھل کر داد دی ہے۔ یہ ظرف کی کشادگی کی بات ہے۔ لہجوں کی مہک کا یہ حصہ اول ہے۔ حصہ دوم کا انتظار رہے گا۔ یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند آئے گی۔

☆☆☆

افسانچہ

مثالی مدرس

ڈاکٹر یوسف صابر (اورنگ آباد)

موبائل :9326772575

''شیخ چاند صاحب آپ کو ریاستی مثالی مدرس کا ایوارڈ مل جائے گا۔ آپ کو سرٹیفکیٹ، مومنٹو اور نقد دس ہزار روپے ملیں گے لیکن اس کے لئے آپ کو پندرہ ہزار روپئے دینے ہوں گے۔''

''خورشید صاحب میں نے اب تک پچاس سے زائد مثالی مدرس ایوارڈز حاصل کئے ہیں اتنے روپئے نہیں لگے۔'' ''جناب یہ ریاستی سرکاری ایوارڈ ہے، اس سے کم میں کام نہیں ہوگا۔ آپ سے پرانے تعلقات ہیں اس لئے پندرہ ہزار مانگے، ورنہ.....!!''

خاکے

خاکہ نگار
ندیم مرزا (بیڑ)
موبائل : 7744014147

غوثیہ سلطانہ نوری

شکاگو (امریکہ)

گوری، صباحت آمیز رنگت، آنکھوں اور لبوں کی قوس قزاح کی طرح رنگ بکھیرتی مسکراہٹ، بولتی ہیں تو برسات کی پہلی پھوار سے نم گیلی مٹی کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے، دیارِ غیر میں اپنی تہذیب اور تمدن کی سفیر بقول اقبال ؎

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

زبان اردو سے گہری وابستگی اور عقیدت ان کے قول سے زیادہ ان کے افعال میں جھلکتی ہے پاس ہو یا دور جو بھی ذرا اردو بولتا، اردو لکھتا ملتا اسے اپنی ممتا سے معمور محبت سے صیقل گری کرکے آفتاب بنانے والی، شعر و ادب کی دلدادہ، ادبی محفلوں، مجلسوں کی روحِ رواں، اردو ادب کی کوئی بھی صنفِ سخن ہو۔ ان کے دستِ کمال سے باہر نہیں۔ نظامت و نقابت کے جوہر دکھاتی ہیں تو پتھروں میں گلاب کھلتے ہیں ان تمام خوبیوں کا چلتا پھرتا متحرک مجموعہ اگر کہیں دکھائی دے تو یقین کرلیں انہی کا نام ہے غوثیہ سلطانہ نوری معلوم ہو کہ طلوعِ صبحِ ادب حیدرآباد کی یہ روپہلی کرن شکاگو، امریکہ میں برصغیر کی تہذیب و تمدن کی، ادبی، سفارتی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

عبدالقادر فاروقی

تقاضہ ہے کہ کھینچوں خاکہ اس جان جاناں کا
زباں کا، دہن کا، قد گل رعنا، نسیم صبح جاناں کا

نظر اٹھا کر دیکھوں، نظر پلٹ جائے، اونچی اڑانیں بھر کے دیکھوں، بال و پر نیم جاں ہو جائیں۔ چمن سے ایک پھول نکلا تھا، دیارِ غیر میں مہکا۔ اس سے ملا تھا، اس کے بچوں سے ملا تھا، اردو کا ایک گلدستہ تھا۔ زباں موتی رولتی تھی ہونٹوں پہ ایک شعر ترجمان تھا ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

چمکتی آنکھیں، چہرہ روشن کتاب، ہونٹوں پہ تبسم کی اک لکیر۔

سوچتا ہے تو اردو   بولتا ہے تو اردو
جس کی زندگی کی ہر حرکت و جنبش پہ اردو کا سایہ ہے
وہی تو عبدالقادر فاروقی کہلایا ہے۔

☆☆☆

شہابِ ثاقب

درمیانہ قد و قامت اور سانولی رنگت کے مالک، غلام ثاقب اپنے فن و کمال کے سبب اپنی پہچان بنانے والے انسان کا نام ہے بچپن ہی سے فیضانِ قلم سے فیض یافتہ ہے۔ تعلیمی دور ہی سے اپنے ہم عصر طلباء میں ممتاز مقام و مرتبہ کے حامل تہہ در تہہ ایک نیا عنوان ... صحافی، شاعر، ادیب افسانہ نگار، افسانچہ نگار، خاکہ نگار، بہترین نقابتی صلاحیتوں کے مالک، کامل حکیمانہ خوبیوں کے حامل، اپنے طلباء کے لیے باپ کی طرح مشفق و مہربان استاد حلقہ احباب کے لیے مثالی دوست!

ان تمام خوبیوں کے باوجود غلام ثاقب کی شخصیت کا روپ ان کی صدا بہار مسکراہٹ میں پوشیدہ ہے۔ زمانے کے زیر و زبر اور شکست و ریخت کی بڑی، بڑی کہانیوں کا گنجینہ گراں مایہ خزانہ، تیز و تند ہواؤں کی زد میں روشن دیا۔ بغیر کسی لالچ و مطلب کے شدید مخالف ماحول میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے بعد، آسمان کی وسعتوں اور اس کی بلند پروازی کو فرزند سولا پور، سلطان ادب، سلطان اختر نے دیکھا۔ محسوس کیا اور پھر ,,منت،، کی صورت دنیائے ادب کے سامنے رکھ دیا (منت) سلطان اختر کی محنت شاقہ کا ثمر ہے اور مراٹھواڑہ کی ادبی تاریخ میں خوبصورت اضافہ ہے علاقائی گروہی عصبیت غلام ثاقب کو ابھرنے ہی نہ دیتی مگر غلام ثاقب کے صبر و کردار کا سلسلہ دراز ہے منت کے مرتب نے ان کی زبان و ادب کی خدمات اور ان کی قلمی کاوشوں کو یکجا کرکے (منت) کی صورت اعترافِ خدمات کا خوبصورت گلدستہ پیش کیا ہے۔ دنیائے ادب میں یقیناً اس کی تعریف و توصیف ہوگی دنیائے ادب کو ایسے روشن ستاروں کی ضرورت ہے اور غلام ثاقب تو ستارہ نہیں شہاب ثاقب ہیں۔

☆☆☆

خلوص عکس ادب

۶ راگست ۲۰۲۳ء

جناب ڈاکٹر یوسف صابر صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔آپ کے روانہ کردہ عکس ادب کے پانچ شمارے آج موصول ہوئے۔ سرورق پراستاد شاہ حسین نہری کی دیدہ زیب وجاذب نظر تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔آپ نے نہایت جانفشانی ومحنت سے گوشۂ شاہ حسین نہری کو سجایا ہے۔ گوشہ کے سبھی مضامین معیاری ومعلومات سے بھر پور ہیں۔ جو شاہ حسین نہری کی شخصیت کو نکھارتے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم راہی کا مضمون بھی کافی دلچسپ ومعلومات سے بھر پور ہے۔ ماہیوں میں نذیر فتح پوری اور آپ کے ماہیے بہت پسند آئے۔غزلیات میں قمر سرور، تمیز پرواز،محمد مستمر کی غزلیں پسند آئیں۔کتابوں پر تبصرے نہایت عرق ریزی ومحنت سے تحریر کئے جاتے ہیں۔ بہت پسند آتے ہیں۔ تصاویر کے ساتھ ادبی خبریں رسالہ کی شان دوبالا کرتی ہیں۔عظیم راہی کا افسانچہ اطمینان، یوسف صابر کا دین ودنیا،علیم اسماعیل کا سر درد، بہت پسند آئے۔غلام ثاقب کے خاکچہ بھی کافی دلچسپ ومواد سے بھر پور ہیں۔پسند آئے یہ آپ ہی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ مجلّہ دن دونی رات چوگنی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔آپ کو بہت بہت مبارک۔تازہ شمارہ کے لیے افسانچہ روانہ کرر ہا ہوں۔شرف قبولیت سے نوازیئے گا۔آپ کے شہر اورنگ آباد میں ۲۳رجولائی کو رسالہ افسانہ نما کا رسم اجراء ہوا۔شاید آپ کو اس کی اطلاع ہوگی۔ پروگرام کی ذمہ داری شہاب افسر خان کو سونپی گئی تھی۔یہ رسالہ افسانہ نما کے مدیراعلیٰ ہیں اور مدیر محمود شاہد ہیں۔ باقی سب لائق شکر

ارشد صدیقی (بیڑ) 8999434891

☆

۱۵رجولائی ۲۰۲۳ء

میرے محترم دوست۔السلام علیکم رحمت اللہ وبرکاتہ

''عکس ادب'' کا تازہ شمارہ ارشد صدیقی صاحب سے ملا۔''عکس ادب'' حقیقت میں جملہ خوبیوں کا مجموعہ ہے اس پر ایک تبصرہ ذہن مین کھیل رہا ہے مکمل ہوتے ہی نذر کردوں گا پیش نظر چند افسانچے اور ایک خاکچہ مرسل خدمت ہے اسی کے ساتھ عزیزی ارشد صدیقی صاحب پرغلام ثاقب صاحب کا تحریر کردہ خاکچہ بھی مرسل خدمت ہے امید کہ پسند آئیں گے۔دعاؤں کا طالب۔ندیم مرزا(بیڑ) 7744014147

☆

۶ستمبر ۲۰۲۳ء

بخدمت،مدیر عکسِ ادب۔السلام علیکم

ڈاکٹر صبیحہ خورشید کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ اس مضمون کو مختصر کیا جاسکتا ہے ۔ ڈاکٹر صبیحہ خورشید نے ناگپور یونیورسٹی سے ماہیے سے متعلق تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور ابھی ناگپور یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔امید کہ اس مضمون کو''عکسِ ادب'' میں شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

نیازمند : محمد اسداللہ (ناگپور) 9579591149

☆

۱۲رستمبر ۲۰۲۳ء

سہ ماہی''عکس ادب'' اورنگ آباد اِس بار رباعی کے حوالہ سے پروفیسر شاہ حسین نہری کی اہم شخصیت پر دلی مسرت ہوئی۔ شاہ صاحب ایک کہنہ مشق ،قادر الکلام اور بزرگ شاعر ہیں۔ رباعی کے میدان میں 'رباعیات شاہ' 'ربیعہ' اور 'شاہ بانی' کے ذریعہ آپ نے اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ایک ممتاز رباعی گو شاعر کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں آپ کا منفرد کام اور اہم مقام ہے۔آپ نے یہ مختصر مگر اہم گوشہ ترتیب دے کر ان کی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔جس کے لئے آپ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاہ حسین نہری صاحب عالم گیرادب (کتابی سلسلہ) اورنگ آباد کے بنیادی رکن ہیں۔ ناچیز بھی اسی کتابی سلسلہ کے مجلس عاملہ میں شامل ہے۔ دیگر احباب کے ساتھ آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں اور ہمیشہ آپ کی رہنمائی حاصل رہتی ہے۔ عالم گیرادب کے کتابی سلسلہ کے تحت آپ کی شخصیت اورفن پر وقیع اورضخیم نمبر شائع ہو چکا ہے۔ شخصی کوائف کے بعد گوشہ کا آغاز ممتاز فکشن نگار نورالحسنین کے لکھے شاہ صاحب کے سراپے سے ہوتا ہے۔نورالحسنین نے سراپا خوب بلکہ بہت خوب لکھا ہے اس فن میں انھیں کمال حاصل ہے۔ رئیس الدین رئیس نے شاہ صاحب کو بجا طور پر مملکت رباعی کے بے تاج شہنشاہ سے تعبیر کیا۔'ربیعہ' کے حوالے سے محترم اسلم مرزا نے آپ کی رباعیات کا ایک اچھا جائزہ پیش کیا ہے اور آپ کو 'شاہ رباعی' سے خطاب کیا ہے۔تمام مضامین اور دیگر قلمکاروں کی آراء اور آپ کی شاعری رباعی کے حوالے سے آپ کے فن کو روشن ومنور کرتے ہیں۔شاہ صاحب کو رباعی کے صنف میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہ مضامین اس بات کا بین ثبوت ہے۔مرحوم سحر سعیدی کے لفظوں میں شاہ صاحب کو اورنگ آباد دکن کے اولین دیوان رباعیات کی حیثیت حاصل ہے اور بقول ابواسامہ (ابن آدم) دکن میں رباعی کی شمع آپ کے دم سے روشن ہے۔شاہ صاحب کو رباعی کے ساتھ فن تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ عکس ادب کے شمارے کے دیگر مشمولات پڑھ کر آپ کی محنت اور مدیرانہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مستقل کالم بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔نصف درجن کتابوں کے آپ کے مختصر مگر جامع انداز میں لکھے گئے تبصرے متوجہ کرتے ہیں۔البتہ مکتوبات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس اہم شمارے کی اشاعت پر ایک بار پھر دلی مبارکباد۔ مخلص : عظیم راہی (اورنگ آباد) ☆

اخبار عکس ادب

سہ ماہی ''عکس ادب'' خصوصی گوشۂ شاہ حسین نہری کا
اجراء، مشاعرہ وایوارڈ

بتاریخ ۱۵؍جولائی ۲۰۲۳ء بروز ہفتہ بعد مغرب بمقام کاشانۂ شاہ حسین نہری، راحت کالونی، نزد اشرفیہ مسجد اورنگ آباد (مہاراشٹر) خصوصی گوشۂ شاہ حسین نہری کا اجراء عمل میں آیا۔ جلسۂ اجراء کی صدارت ڈاکٹر دوست محمد خان (موظف پرنسپل ماہر تعلیمات) کے ذمہ تھی۔ ''عکس ادب'' کا اجراء بدست ڈاکٹر ابواسامہ ابن آدم (محقق، نقاد، افسانہ نگار، ماہر ادب اطفال اور رباعیات مالیگاؤں) عمل میں آیا۔ جلسۂ اجراء کی نظامت ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے نہایت عمدگی سے انجام دی۔ اجراء کے بعد اسلم مرزا کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں اسلم مرزا، شاہ حسین نہری، شفیع احمد شفیع (پربھنی)، معز ہاشمی، ڈاکٹر ابواسامہ ابن آدم، احمد اورنگ آبادی، ڈاکٹر سلیم نواز حشر جعفر آبادی اور ڈاکٹر یوسف صابر نے اپنا منتخب کلام پیش کر کے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ مشاعرہ کی نظامت ارشاد ضیاء (پربھنی) نے بحسن و خوبی انجام دی۔ اس پروگرام میں بدست ڈاکٹر یوسف صابر کہنہ مشق شاعر، ماہر رباعیات شاہ حسین کو ''عکس ادب'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس پروگرام میں نورالحسنین (ممتاز فکشن نگار و خاکہ نگار)، شفیع احمد شفیع (استاد شاعر و ماہر علم عروض)، عطا اللہ شاہ، ڈاکٹر عظیم الدین، ڈاکٹر عظیم راہی، سرتاج شاکر، احمد خان ایم اے اور مسعود احمد قیصر بحیثیت مہمانانِ خصوصی مدعو تھے۔ آفاق الرحمن خان کے شکریہ کے ساتھ اس خوبصورت ادبی محفل کا اختتام ہوا۔ یہ پروگرام منجانب سہ ماہی ''عکس ادب'' عمل میں آیا اور اس پروگرام کے کنوینر ابراہیم خان (موظف سینٹرل ایکسائز آفیسر) تھے۔

پربھنی میں بیادِ سید خالد عرف سجولا مشاعرہ

پربھنی۔ ۱۶؍جولائی شب ۹ بجے بمقام شاہی کارنر سجولالہ متر منڈل نزد طیبہ روٹی بینک، پربھنی میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد سجولالہ متر منڈل کی جانب سے کیا گیا۔ جس کی صدارت شہر کی معزز شخصیت حاجی مرزا انور بیگ نے کی۔ صدر مشاعرہ و تمام شعراء کا شایان شان استقبال اس کارواں کے روح رواں سید سمیع عرف ماجولالہ نے کیا اور عمران حسینی، صغیر احمد خان، وشال بدونت، عمر چاؤش، محمد اصرار وغیرہ سے بھی مہمانوں کا استقبال کروایا۔ ناظم مشاعرہ ارشاد ضیاء نے اردو مشاعروں کی روایات اور سجولالہ کے اوصاف حمیدہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے حفیظ چاؤش و سید سمیع عرف ماجولالہ کی ادبی، سماجی، ملی و تعلیمی خدمات کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ مشاعرے کا آغاز محمد کیفی نے حمد پاک سے کیا اور ہدیہ نعت کا نذرانہ مہمان شاعر سہیل آزاد نے پیش کیا۔ شفیع احمد شفیع نے بعنوان بیادِ سید خالد عرف سجولالہ مرصع نظم پیش کی، جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ جن شعراء نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا ان میں سہیل آزاد مالیگاؤں، شفیع احمد شفیع، سندر مالیگانوی، عبدالواحد جاذب، رمیش گیری (ناندیڑ)، حبیب ہاشمی، رئیس الزماں، طٰہٰ صدیقی اور سیفی اعظمی سیف کے نام شامل ہیں۔ مشاعرے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں عمران حسینی، صغیر احمد خان، علیم ضوفی، سعید پاشا، شیخ عادل، شیخ رشید، افتخار عرف افو، نجم خان، مظہر خان، یوسف باغبان، انور خان، عبدالوحید اور انور پھلاری کا اہم رول رہا۔ رات دیر گئے ارشاد ضیاء کے اظہار تشکر پر مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

☆ مشاعرے کے موقع پر لی گئی ایک تصویر ☆

سید سمیع عرف ماجولالہ کے ساتھ شفیع احمد شفیع، سیفی اعظمی سیف، حبیب ہاشمی، طٰہٰ صدیقی، شیخ رشید، ارشاد ضیاء اور دیگر معزز ادب نواز حضرات۔

ڈاکٹر یوسف صابرؔ کے اعزاز میں شعری نشست

پربھنی۔ بتاریخ ۲۱؍جولائی ۲۰۲۳ء ڈاکٹر یوسف صابرؔ مدیر سہ ماہی 'عکس ادب' کے اعزاز میں بمکان محبّ اردو محمد عبدالباقی، بارہ امام پربھنی میں ایک کامیاب نعتیہ وغیر نعتیہ شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت ابوعبید یوسف (حیدرآباد) نے کی۔ صاحب خانہ نے صدر مشاعرہ، صاحب اعزاز وتمام شعراء کا شایانِ شان استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض ارشاد ضیاء نے بحسن وخوبی انجام دیئے۔ نشست کا آغاز طٰہٰ صدیقی نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ جن شعراء نے سامعین کو اپنے نعتیہ وغیر نعتیہ کلام سے محظوظ کیا اُن میں ابوعبید یوسف، ڈاکٹر یوسف صابرؔ، شفیع احمد شفیعؔ، عبدالواحد جاذبؔ، کلیم کسکؔ، حبیب ہاشمی، وحید اسلم، رئیس الزماں، طٰہٰ صدیقی، سیفی اعظمی سیفؔ اور محمد کیفی کے نام شامل ہیں۔ سعید پاشاہ، شیخ عادل ودیگر باذوق سامعین نے شرکت کی اور نشست کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ رات دیر گئے سیفی اعظمی سیفؔ کے اظہارِ تشکر پر نشست کا اختتام ہوا۔

ڈاکٹر عظیم راہی کی کتاب ''طرز بیاں اپنا'' کا اجراء

اورنگ آباد۔ ۴؍ستمبر (راست) اقبال اکیڈیمی، کتابی سلسلہ عالمگیر ادب، اورنگ ادب، اورنگ آباد کے اشتراک سے ڈاکٹر عظیم راہی کی تازہ تصنیف ''طرز بیاں اپنا'' کی رسم اجراء بروز اتوار بتاریخ ۳؍ستمبر ۲۰۲۳ء کو بیت الیتیم کے عالمگیر ہال میں' ممتاز ادیب و استاد محترم احمد اقبال کے ہاتھوں انجام پائی جبکہ تقریب کی صدارت کہنہ مشق شاعر وادیب' نقاد ومحقق اور تاریخ داں ایڈوکیٹ اسلم مرزا نے کی۔ اس تقریب میں مہمانان خصوصی کے طور پر کہنہ مشق شاعر پروفیسر شاہ حسین نہری، معروف فکشن نگار نورالحسنین، ڈاکٹر ارتکاز افضل، محترم خالد سیف الدین، ڈاکٹر یوسف صابرؔ اور ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ نے شرکت کی۔ محمود شکیل، فاروق شمیم اور ڈاکٹر شہاب افسر تقریب کے مہمانِ اعزازی تھے۔ تقریب کا آغاز محمد انس کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ بعد ازاں ڈاکٹر اسود گوہر اور خان محمد یاسر نے زیرنظر کتاب پر اپنے مضامین پیش کئے۔ ان کے بعد مہمانان خصوصی نے صاحب اعزاز ڈاکٹر عظیم راہی اور ان کی تازہ تصنیف کے حوالے سے ان کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ (تصویر گوشہ کے صفحات پر ملاحظہ کیجئے)

ڈاکٹر محمد عبدالرافع عالمی جماعت نظامیہ کے پہلے شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ایوارڈ ۲۰۲۳ء سے نوازے گئے

دہلی: حضرت خواجہ سید محمد نظامی دہلی رتن مدظلہ العالی جانشین حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی فخر دہلیؒ و سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی، شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ۷۰؍ویں سالانہ عرس کے موقع پر ایک آل انڈیا سیمینار بعنوان حضرت خواجہ حسن نظامیؒ زندگی اور کارنامے پر بمقام خواجہ ہال، بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، نئی دہلی میں بروز جمعہ، ۷؍جولائی ۲۰۲۳ء کو منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر محمد عبدالرافع کے پی ایچ ڈی مقالے ''حضرت خواجہ حسن نظامیؒ حیات و ادبی خدمت'' کی کتاب کا رسم اجراء عمل میں آیا۔ عالمی جماعت نظامیہ کی مشارتی مجلس کی جانب سے شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے نام سے اردو زبان کی ادبی و تعلیمی خدمات انجام دینے والے ادیب وشاعر کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور پہلے شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ایوارڈ ۲۰۲۳ء کے لیے ڈاکٹر محمد عبدالرافع ناندیڑ کو منتخب کیا گیا۔ اِس ایوارڈ میں توصیف نامہ، مومنٹو اور پچیس ہزار روپے نقد پیش کیے گئے۔ اس جلسے کی صدارت ہندوستان کے مشہور دانشور، پدم شری پروفیسر اختر الواسع صاحب نے فرمائی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر عالی جناب ڈاکٹر سید فاروق صاحب (مالک ہمالیہ ڈرگس)، عالی جناب حامد احمد صاحب اور ڈاکٹر محمد عبدالرافع حاضر تھے۔ معزز شرکاء میں مختلف درگاہوں کے سجادہ نشین و مشائخ کرام کے علاوہ حضرت سہیل فریدی صاحب، پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب، حضرت پیر پاشا نظامی قادری صاحب، پروفیسر فخرالدین نظامی صاحب، عالی جناب ملاحی الدین خالد نظامی صاحب، عالی جناب فاروق ارگلی صاحب، ڈاکٹر عقیل احمد صاحب (غالب اکیڈمی دہلی)، عالی جناب پروفیسر محمد معظم الدین صاحب (شعبہ اردو این سی ای آر ٹی دہلی) عالی جناب افضل منگلوری، اور دیگر ادیب، قومی رہنما، اسکالر اور شعراء نے شرکت فرما کر اپنے مقالہ جات وکلام کو پیش کیا۔ جماعت نظامیہ کے ذمہ داران، خلفاء ومریدین نے ڈاکٹر محمد عبدالرافع صاحب کو ان کی کتاب کے رسم اجراء اور پہلے شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ایوارڈ ۲۰۲۳ء ملنے پر مبارکباد دی۔ نیز علاقہ مراٹھواڑہ وریاست مہاراشٹر کے ادباؤ شعراء اور دوست احباب و رشتہ داروں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکبادی کے پیغامات ارسال کیے ہیں۔